

۲۴۔ جنوری ۱۹۷۱ء

بچاؤ!

PETROL

آمدنی ٹیکس

بے روزگاری

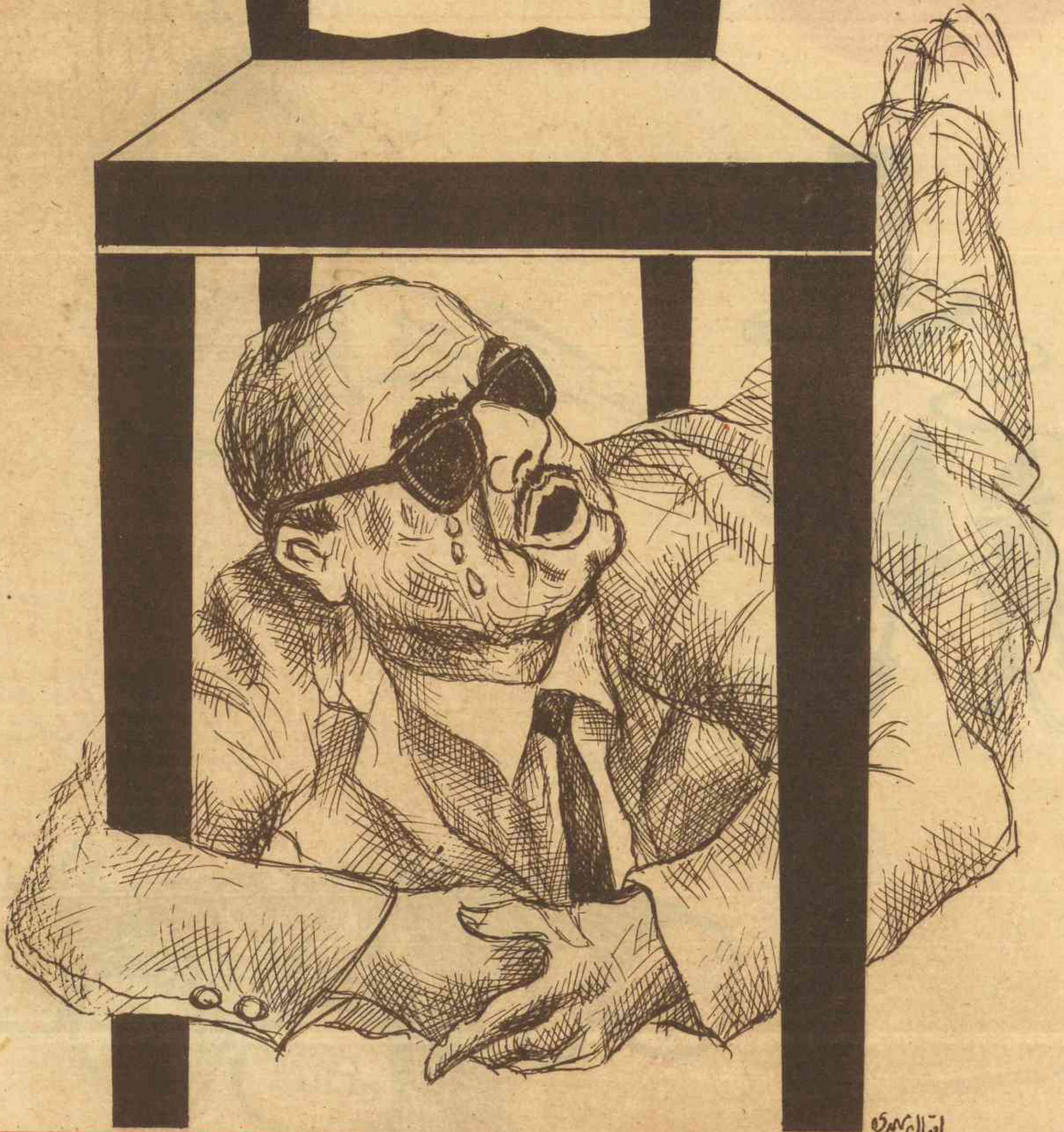
مرکزی ٹیکس

منافع خوری

بلدیاتی ٹیکس

مہنگائی

جلتی پر تیل



"کرسی مجھے نہیں چھوڑتی" ۔ وائس چانسلر کے استبداد کی تفصیل

صفحہ ۱۵ پر ملاحظہ کیجئے

ہفت روزہ کراچی

لیل و نہار

جلد ۲ | ۱۸ تا ۲۴ جنوری ۱۹۷۱ء | شمارہ ۳

ادارہ تحریر

فیض احمد فیض ——— حسن عابدی

امین مغل لاہور ——— احمد الیاس ڈھاکہ

فون نمبر ——— ۴۱۷۴۹۰

قیمت

مغربی پاکستان میں ——— ۶۰ پیسے

مشرقی پاکستان میں ——— ۷۵ "

گوادر، پسنی میں ——— ۷۰ "

برطانیہ میں ——— ۲ شلنگ ۶ پنس

پوسٹ بکس نمبر ۳۱۷۸ / ۵ - کراچی ۲۹

مرغوب [illegible]
۱۸ / جنوری ۱۹۷۱ء

دولتِ مُشترکہ اور ہم

دولتِ مشترکہ کی سترھویں کانفرنس اِن دِنوں سنگاپور میں ہو رہی ہے۔ یہاں مٹی کے اس شعبدے میں اکتیس ملکوں کے نمائندے شریک ہیں۔ اِس کانفرنس کی رُوحِ رواں برطانوی حکومت ہے اور کانفرنس میں تو مادی ہے جو فرنگی چاہتے ہیں لیکن اَب کے میزبانی کی سعادت پہلی بار ایک ایسے "ایشیائی ملک" کو نصیب ہوئی ہے جس کی آبادی اور رقبہ کراچی سے بھی کم ہے۔ البتہ وہاں برطانیہ کا بحری بیڑا موجود ہے۔

یوں کہنے کو تو کانفرنس میں ایشیا اور افریقہ کے نمائندوں کی غالب اکثریت ہوگی (۲۷) اور آبادی کے اعتبار سے بھی دولتِ مشترکہ کے ہر دس میں سے آٹھ باشندے انہی دونوں براعظموں سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اِن نو آزاد ملکوں کے گلے میں پونڈ اور ڈالر کا پھندا اتنا سخت لگا ہے کہ بیچاروں کی زبان سے جی ہاں، جی حضور کے سوا دوسرا لفظ نکلتا ہی نہیں۔ وہ اپنی اکثریت کیا خاک منوائیں گے۔ اُن کے لئے یہی کیا کم اعزاز ہے کہ برطانیہ، کینیڈا اور آسٹریلیا کے سفید فام نمائندے اُنہیں اپنے برابر بٹھاتے ہیں اور وقتاً فوقتاً امداد کے لقمے کھلاتے ہیں۔

اس کانفرنس میں بعض نہایت اہم مسائل زیرِ بحث آئیں گے۔ مثلاً مشرقِ قریب میں اسرائیلی جارحیت، خلیج فارس کی عرب ریاستوں کا مستقبل، جنوبی افریقہ کو برطانوی اسلحہ جات کی فراہمی اور بحرِ ہند کے جزیرہ گارچیا میں اینگلو امریکی فوجی اڈے کا قیام۔ البتہ برطانیہ کے وزیرِ اعظم اُس نسلی امتیاز اور بدسلوکی پر غور نہیں کریں گے جو برطانیہ میں مقیم کالے باشندوں کے ساتھ روا رکھی جاتی ہے۔ کیونکہ یہ برطانیہ کا نجی مسئلہ ہے۔ وہ کشمیر کی نزاع پر بھی غور کرنے کو آمادہ نہیں ہیں کیونکہ کشمیر ہندوستان اور پاکستان کا نجی مسئلہ ہے۔ اسی طرح ویت نام میں مقیم آسٹریلین افواج کا مسئلہ بھی زیرِ بحث نہیں آئے گا کیونکہ یہ آسٹریلیا کا نجی مسئلہ ہے۔

کینیڈا کے وزیرِ اعظم مسٹر ترودو اور برطانیہ کے وزیرِ اعظم مسٹر ہیتھ نے سنگاپور جاتے ہوئے اسلام آباد میں صدر یحییٰ خاں سے بھی ملاقات کی تھی۔ غالباً اِس ملاقات کا مقصد پاکستان کو اپنا ہم خیال بنانا تھا۔ معلوم نہیں حکومتِ پاکستان نے مسٹر ہیتھ کی دلیلوں کو تسلیم کیا یا نہیں لیکن مسٹر ہیتھ کی پریس کانفرنس اور ٹیلی وژن انٹرویو سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ صدر یحییٰ خاں سے ملنے کے بعد بھی مسٹر ہیتھ کے موقف میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے مثلاً مسٹر ہیتھ جنوبی افریقہ کو اسلحہ جات فراہم کرنے پر مُصر ہیں اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ جنوبی افریقہ کا دفاع ضروری ہے کیونکہ بحرِ ہند میں رُوسی جہازوں کی آمد و رفت بڑھ گئی ہے۔ حیرت ہے کہ رُوسی جہازوں سے فقط جنوبی افریقہ ہی کو خطرہ لاحق ہے حالانکہ سنگاپور سے دارالسلام تک درجنوں ملک بحرِ ہند کے ساحل پر واقع ہیں مگر کسی نے اب تک اس خطرے کا اظہار نہیں کیا۔ نہ ملائشیا نے، نہ سیلون نے نہ پاکستان نے نہ سعودی عرب نے اور نہ تنزانیہ نے۔ دراصل رُوسی خطرہ ایک ایسا عذر ہے جس سے ہر سامراجی حکومت اپنی مجرمانہ حرکتوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اسلحہ جات جنوبی افریقہ کے "دفاع" کے لئے فراہم نہیں کئے جا رہے ہیں بلکہ ان سے جنوبی افریقہ، رہوڈیشیا اور

دوسری مغربی مقبوضات میں افریقی باشندوں کی جنگِ آزادی کو کچلنے کا کام لیا جائے گا۔ اِن علاقوں میں غالب اکثریت افریقیوں کی ہے لیکن ان پر حکومت کرتے ہیں مٹھی بھر سفید فام سامراجی۔ افریقیوں کو نہ ووٹ کا حق ہے اور نہ انہیں نظم و نسق میں شریک کیا جاتا ہے۔ مگر برطانوی حکومت کو جنوبی افریقہ کی فاشسٹ حکومت اتنی عزیز ہے کہ وہ دولتِ مشترکہ کے افریقی اور ایشیائی ملکوں کو ناراض کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں سمجھتی۔ لیکن جنوبی افریقہ کی یہ پاسداری خالی از علت نہیں ہے۔ اس کا باعث دونوں ملکوں کے سامراجی مفاد ہیں۔ قصہ یہ ہے کہ جنوبی افریقہ کی ہیرے کی کانوں اور دوسری معدنی صنعتوں میں برطانوی سرمایہ داروں نے کروڑوں روپے لگا رکھے ہیں۔ اس سرمائے سے اب تک وہ اربوں روپے منافع کما چکے ہیں اور ہرگز نہیں چاہتے کہ یہ دولتِ خداداد افریقی باشندوں کے تصرف میں آئے۔ اس کے علاوہ برطانوی بینک، انشورنس کمپنیاں، جہاز راں ادارے اور درآمد برآمد کرنے والے سوداگر جنوبی افریقہ کی معیشت سے خاطر خواہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ سینکڑوں انگریز خاندان ہر سال برطانیہ سے ہجرت کر کے جنوبی افریقہ میں آباد ہوتے رہتے ہیں۔ وہاں ان کو برطانیہ سے زیادہ مراعات اور سہولتیں ملتی ہیں۔ برطانیہ کے قدامت پرست حلقوں کی نظر میں جنوبی افریقہ ایک مثالی ریاست ہے جہاں سفید فام آقاؤں کو کالے باشندوں کی جان مال اور عزت و آبرو پر پورا پورا اختیار حاصل ہے۔ ہیتھ کی قدامت پرست حکومت اسی جنت ارضی کی حمایت اور حفاظت کے لئے بہت بے چین ہے۔ اور چاہتی ہے کہ پاکستان اگر اس کا ساتھ نہ دے سکے تو کم از کم خاموش رہے لیکن اب پانی سر سے اونچا ہوتا جا رہا ہے چنانچہ قرائن کہتے ہیں کہ دولتِ مشترکہ میں شریک ہونے والے افریقی ممالک۔ زیمبیا، تنزانیہ اور یوگانڈا۔ جنوبی افریقہ کو اسلحہ جات کی فراہمی کو افریقہ کی آزادی کے لئے زبردست خطرہ سمجھتے ہیں اور اگر برطانیہ اپنی ضد پر قائم رہا تو غالباً یہ ملک دولتِ مشترکہ سے علیحدہ ہو جائیں گے۔

دوسرا نزاعی مسئلہ جزیرہ گارچیا میں اینگلو امریکی فوجی اڈے کا ہے۔ یہ جزیرہ سیلون کے جنوب میں واقع ہے۔ سیلون دولتِ مشترکہ کا رکن ہے اور مسٹر ہیتھ دولتِ مشترکہ کے بڑے ثناخواں ہیں لیکن انہوں نے نہ سیلون سے مشورہ کیا اور نہ دولتِ مشترکہ کی کانفرنس کا انتظار ضروری سمجھا بلکہ کانفرنس سے فقط ایک ماہ قبل واشنگٹن جا کر امریکہ سے فوجی اڈے کی ساز باز کر لی۔

مسٹر ہیتھ نے اس فوجی اڈے کے لئے بھی روسی خطرے کا عذر پیش کیا ہے اور کہا ہے کہ بحرِ ہند میں روسی جہازوں کی آمد و رفت سے دولتِ مشترکہ کا تجارتی راستہ غیر محفوظ ہو گیا ہے۔ مانا کہ ہمارے آقاؤں کو بحرِ ہند کی حفاظت کا بہت خیال ہے لیکن حفاظتی تدابیر اختیار کرنے سے قبل اگر انہوں نے بحرِ ہند کے ساحلی ملکوں سے پوچھ لیا ہوتا تو ہم کو ان کے سامراجی عزائم پر شک کرنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ افسوس اس کا ہے کہ بحرِ ہند کے ساحلی ملکوں میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ اینگلو امریکی سامراج کو حکم دے سکیں کہ بحرِ ہند سے اپنے اڈے ہٹاؤ ورنہ ہم انہیں نیست نابود کر دیں گے۔ البتہ سیلون کی وزیراعظم مسز بندرانائیکے دولتِ مشترکہ کی کانفرنس میں یہ تجویز پیش کرنے والی ہیں کہ بحرِ ہند کو "خطۂ امن" قرار دیا جائے یعنی بحرِ ہند میں نہ فوجی اڈے قائم ہوں، نہ ایٹم بم کے تجربے کئے جائیں اور نہ تجارتی آمد و رفت میں کوئی رکاوٹ ڈالی جائے۔

اگر برطانیہ خلوصِ دل سے یہی چاہتا ہے کہ بحرِ ہند کا تجارتی راستہ محفوظ رہے تو اُسے سیلون کی تجویز منظور کر لینی چاہیئے لیکن ہم جانتے ہیں کہ گارچیا کے فوجی اڈے کا مقصد تجارتی راستے کا تحفظ نہیں ہے بلکہ وہاں جاسوسی کا مرکز قائم ہو رہا ہے۔

دراصل برطانیہ اب ایشیا میں امریکی سامراج کا دلال بن گیا ہے اور اس کا کام فقط یہی رہ گیا ہے کہ امریکہ کے احکام پورے کرتا رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ برطانوی دولتِ مشترکہ بھی سیٹو، سینٹو اور نیٹو کی مانند ایک سامراجی ادارہ ہے۔ اس کا مقصد برطانوی سامراج کے سیاسی اور معاشی مفادات کو تقویت پہونچانا ہے۔ لہٰذا برطانیہ، کینیڈا اور آسٹریلیا کے لئے تو یہ ادارہ بہت مفید ہے لیکن ایشیا اور افریقہ کے نو آزاد ملکوں کے لئے نہایت مضر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے ترقی پسند حلقوں نے ابتدا ہی سے دولتِ مشترکہ کی مخالفت کی ہے اور ان کا مطالبہ ہے کہ پاکستان دولتِ مشترکہ کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکے۔ اور اپنی سیاست اور معیشت کی بنیاد کو اینگلو امریکی سامراج کے بندھنوں سے آزاد کرے کہ ملک کی ترقی اور خوشحالی کا انحصار اسی پر ہے۔



پریس ٹرسٹ کی آمریت سے اخبارات کو نجات دلائی جائے

احوالِ وطن

پی پی ایل کی انتظامیہ کو فوراً برطرف کیا جائے

پروگریسیو پیپرز لمیٹڈ کے ہڑتالی کارکنوں اور بھوک ہڑتالیوں کی جدوجہد اب کسی ایک ادارے اور ایک شہر تک محدود نہیں رہی بلکہ آزادیٔ صحافت کی ملک گیر جدوجہد کا حصہ بن گئی ہے اور اس میں نہ صرف صحافی بلکہ قومی کارکن، تعلیمی ماہر، عالم اور دانشور اور مزدوروں اور کسانوں کے رہنما بھی شامل ہوگئے ہیں۔

ممتاز ادیب اور صحافی جناب صفدر میر اور ان کے چار رفقاء نے بھوک ہڑتال کا آغاز کیا۔ پولیس نے انھیں گرفتار کرلیا، لیکن جنونِ عشق کے انداز کہیں قید و بند سے چھوٹتے ہیں۔ انتظامیہ کو غلط فہمی تھی کہ پانچ چھ افراد کی گرفتاری سے پی پی ایل کے دفاتر میں اور شہر میں "امن" بحال ہوجائے گا اور بائیس خاندانوں کے گماشتے صحافیوں کو ہراساں کرنے اور اُن کے ہمدردوں کو ہدفِ انتقام بنانے میں کامیاب ہوجائیں گے بھوک ہڑتالیوں کے دستے آگے آتے رہے، اور شہر کی صورتِ حال پولیس کی اشتعال انگیزی کے باعث خراب تر ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ فوج کو مداخلت کرنی پڑی۔

پی پی ایل، جس کے تحت پاکستان ٹائمز، اور امروز ہردو مرحوم اخبارات دس بارہ سال تک آزادیٔ رائے اور آزادیٔ تحریر و تقریر کی جنگ، رجعت پرستوں کے خلاف لڑتے رہے اور جمہوری اندازِ فکر کی نشوونما کرتے رہے، محض ایک اخباری ادارہ نہیں، بلکہ پاکستان میں آزادیٔ افکار کا سب سے مضبوط قلعہ تھا، چنانچہ ایوب خاں نے اپنی آمریت کی بقا کے لئے محض سیاسی پارٹیوں کو معطّل کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ آگے بڑھ کر پی پی ایل کا گلا گھونٹ دیا، کیونکہ اس ادارے کے اخبارات نے عوام کی سیاسی تربیت کے لئے ہر سیاسی پارٹی سے کہیں بڑا کردار ادا کیا تھا۔ آمریت کے دَور میں پُرانے کارکنوں نے بہرطور ان اخبارات کو زندہ رکھا اور ماضی میں جو روشن روایات قائم ہوئی تھیں، اُن سے کسبِ نور کرتے رہے، حالانکہ اس تمام عرصے میں ان اخبارات پر نہ صرف آمریت کا بلکہ پریس ٹرسٹ کے زیرِ تسلّط ۲۲ خاندانوں کے اشتراک سے بدترین نوکرشاہی کا غلبہ قائم رہا۔

پریس ٹرسٹ کے ماتحت شیخ رحمان اور دوسرے سرکاری گماشتوں نے ایک طرف تو پی پی ایل کو مالی طور پر دیوالیہ کردیا، دوسرے اِن صحافیوں کو اخبارات سے نکالنے کی سازش کی جو فرض شناس، ذی فہم، غیرت مند اور خودنگر تھے اور اپنے حقوق کی جدوجہد میں سرگرم رہتے آئے تھے۔ دراصل ان عناصر نے یہ بھانپ لیا تھا کہ ٹرسٹ اب کوئی گھڑی کا مہمان ہے۔ خود صدر یحییٰ نے اس بارے میں صحافیوں کو اطمینان دلایا تھا اور ملک کی بیشتر سیاسی پارٹیاں، جن میں پیپلز پارٹی، عوامی لیگ، کونسل مسلم لیگ اور نیشنل عوامی پارٹی شامل ہیں، اس کی تنسیخ کا وعدہ کرچکی تھیں۔ لہٰذا پی پی ایل کے منتظمین نے غالباً سوچا کہ گھر کو چھوڑنا ہی پڑا تو اس کی دیواریں کیوں نہ کھوکھلی کردی جائیں، تاکہ یہ ادارہ، اصل ہاتھوں میں پہنچنے تک اتنا کمزور ہوجائے کہ اپنا کردار ادا نہ کرسکے اور دم توڑ دے۔

کارکنوں کا مطالبہ یہ ہے کہ پریس ٹرسٹ کو توڑا جائے اخبارات کو اجارہ دار سرمایہ داروں کی گرفت سے آزاد کرایا جائے۔ پی پی ایل کی انتظامیہ کو فوری طور پر معطّل کرکے وہاں کے معاملات کی پڑتال کرائی جائے اور اب تک جس قدر ملازم برطرف کئے گئے ہیں، اُن سب کو ملازمتوں پر بحال کیا جائے۔ یہ تمام مطالبات مبنی برحق ہیں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ ان میں سے کسی ایک مطالبے سے بھی گریز کا عذر کیا ہوسکتا ہے۔ ایوب خاں کی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں تمام شریک پارٹیوں کا یہ مطالبہ تھا کہ ٹرسٹ کو توڑا جائے اور اس کے اخبارات اصل مالکوں کے حوالے کئے جائیں۔ یہی مطالبہ کارکن صحافیوں کی وفاقی تنظیم آج برسوں سے کرتی آئی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ٹرسٹ کی گرتی ہوئی دیوار کو اب کوئی طاقت سہارا دے کر کھڑی نہیں رکھ سکتی۔

ایک تجویز یہ ہے کہ ٹرسٹ کے اخبارات کو ان کے کارکنوں کے حوالے کردیا جائے۔ بظاہر یہ نعرہ "مزدور دوستی" پر مبنی اور بڑا دلفریب نظر آتا ہے، لیکن دو باتیں اس سلسلے میں محلِّ نظر ہیں۔ اوّل یہ کہ ایوب آمریت نے جارحانہ قانون نافذ کرکے جن اخبارات کو ان کے مالکان سے چھین لیا تھا، قرینِ انصاف یہ ہے کہ وہ اخبارات انہیں واپس کردیئے جائیں۔ دوسری بات یہ کہ آزاد مقابلے اور سرمایہ دارانہ معیشت کے اس نظام میں، جو ہمارے یہاں رائج ہے، اِکّا دُکّا اخبارات کارکنوں کی اجتماعی ملکیت کے تحت پنپ نہیں سکتے۔ یہ تجربہ نہ صرف ہمارے یہاں بلکہ بعض دوسرے ملکوں میں بھی ناکام ہوچکا ہے۔ البتہ سوشلزم کا قیام منظور ہے تو پہلے بڑی بڑی اور بنیادی صنعتیں قومی ملکیت میں لی جائیں۔ لیکن اخبارات کو قومی ملکیت میں لینے کا مرحلہ شاید اس کے بعد بھی نہ آئے۔ بہرحال اگر کچھ لوگوں کے خیال میں پی پی ایل کو اس کے کارکنوں کی ملکیت میں دینا ہی سوشلزم کی بنیاد ہے تو پھر سوشلزم کے وسیع تر مفاد کا تقاضہ یقیناً یہ ہوگا کہ تمام اخبارات ان کے مالکوں سے لے کر، ان کے کارکنوں کے سپرد کردیئے جائیں۔

ایک خطرناک تجویز

حیرت ہے کہ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے طرزِ عمل میں انتخابات کے بعد بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ نہ افسر شاہی کے سوچنے کا انداز بدلا ہے اور نہ کام کرنے کے طریقوں ہی میں کوئی فرق آیا ہے۔ جن خطوط پر اربابِ اختیار، دسمبر سے پہلے چلتے تھے انھیں خطوط پر اب بھی گامزن ہیں۔ اُن کو اس بات کا قطعاً احساس نہیں ہے کہ جن سیاسی جماعتوں کو ملک کی غالب اکثریت کا اعتماد حاصل ہوا ہے وہ کس انداز میں سوچتی ہیں اور اُن کی حکمتِ عملی اور طریقِ کار کیا ہوگا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی نے ملک کے سماجی اور معاشی ڈھانچے کو سوشلزم کی بنیادوں پر بدلنے کا عہد کیا ہے لیکن افسر شاہی کو اس کی پروا نہیں ـــ وہ اپنے روایتی انداز میں کام کررہی ہے۔ مرکزی اور صوبائی سطح پر منصوبے بنتے ہیں ـــ ٹیکس لگائے جاتے ہیں، سامراجی حکومتوں سے امداد حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے حتیٰ کہ بیرونی سرمایہ داروں سے درخواست کی جاتی ہے کہ آؤ اور پاکستان میں سرمایہ لگاؤ اور نفع کماؤ ـــ دوسرے ملکوں کے سربراہوں سے گفت و شنید ہوتی ہے لیکن کسی کام میں بھی نہ عوامی لیگ کے رہنماؤں سے مشورہ کیا جاتا ہے اور نہ پیپلز پارٹی کے رہنماؤں سے۔ حالانکہ موجودہ حکومتیں عارضی حکومتیں ہیں اور انھیں غالباً جلد ہی عنانِ اختیار عوامی نمائندوں کے حوالے کرنی ہوگی۔

جمہوری ملکوں کی روایت بھی یہی ہے۔ چنانچہ ہمیں یاد ہے، کہ دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں برطانیہ کے وزیرِ اعظم مسٹر چرچل جب پوستدم کانفرنس میں شریک ہوئے تو وہ مسٹر ایٹلی کو بھی جو لیبر پارٹی کے لیڈر تھے اپنے ہمراہ لے گئے تھے حالانکہ اس وقت تک انتخابات بھی نہیں ہوئے تھے اور نہ لیبر پارٹی برسرِ اقتدار آئی تھی۔ لیکن ہمارے ملک میں مسٹر بھٹو اور شیخ مجیب الرحمٰن سے

کسی ملکی یا خارجی مسئلے پر مشورہ نہیں کیا جاتا اور نہ حکومت کی پالیسی کے بارے میں ان کی رائے معلوم کی جاتی ہے۔

ایئر مارشل نور خاں نے غالباً اسی بنا پر یہ تجویز پیش کی ہے کہ ملک کے نظم و نسق میں عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی کے نمائندوں کو فوراً شریک کر لینا چاہئے اور دستور کی تکمیل کا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔ یہ افواہیں بھی سننے میں آرہی ہیں کہ صدر یحییٰ خاں صوبوں کا نظم و نسق صوبوں کی اکثریتی جماعتوں کے سپرد کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ایئر مارشل صاحب یہ بھول گئے کہ ملک میں اس وقت مارشل لاء کی حکومت ہے اور جب تک مارشل لاء ختم نہیں ہوتا جمہوری پارٹیاں کس اصول کے تحت نظم و نسق میں شریک ہوں گی اور کس قانون کے تحت ملکی مسائل کا حل تلاش کریں گی۔ افسر شاہی کاغذی گھوڑے دوڑانے کی عادی ہے۔ لیکن کاغذی کارروائیاں تعمیری کاموں کی راہیں حائل ہوتی ہیں لہٰذا افسر شاہی کا اثر اور اختیار توڑنا ضروری ہوگا۔ لیکن جمہوری آئین کی عدم موجودگی میں افسر شاہی کے بجائے عوام کے ذریعہ کام کو پورا کرنا کیونکر ممکن ہوگا۔ اور اگر عوام نے تعاون نہ کیا تو عوامی نمائندے اپنے بنیادی مقاصد میں نہ صرف ناکام ہو جائیں گے بلکہ اُن کو نیک نامی کے بجائے بدنامی کا منہ دیکھنا نصیب ہوگا۔ لوگ یہی کہیں گے کہ دیکھا نہ کرسی پر جاکر بیٹھ گئے اور ہم سے جو وعدے کئے تھے اُن کو فراموش کر دیا۔

یہی دشواری صوبائی نظم و نسق سنبھالنے میں پیش آئے گی۔ اس وقت تمام صوبوں میں مارشل لا کے مقرر کردہ فوجی گورنر برسرِ اقتدار ہیں۔ وہ عوام کے روبرو جواب دہ نہیں ہیں بلکہ براہِ راست صدر مملکت کے ماتحت ہیں۔ ایسی صورت میں پیپلز پارٹی یا عوامی لیگ یا نیشنل عوامی پارٹی کے وزراء نے اگر صوبائی حکومتوں میں شرکت کرلی تو اُن کو مارشل لاء کے تحت کام کرنا ہوگا۔ اس کے علاوہ ابھی تک صوبائی خود مختاری کے حدود بھی متعین نہیں ہوئے ہیں اور نہ مرکز اور صوبوں کے اختیارات کی تقسیم عمل میں آئی ہے۔ پھر وہ جماعتیں جو صوبائی خود مختاری کا وعدہ کر چکی ہیں اپنے وعدے سے انحراف کیسے کرسکیں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ جمہوری جماعتوں نے اگر آئین کی تکمیل سے پہلے حکومت میں شرکت کرلی تو وہ افسر شاہی کی اسیر ہو جائیں گی اور افسر شاہی اُن کے ساتھ وہی سلوک کرے گی جو وہ اس سے پیشتر سابقہ سیاسی جماعتوں سے کرتی رہی ہے۔

ضروری تصحیح

لیل و نہار، ۱۰ جنوری ۱۹۷۱ء کی اشاعتِ خصوصی میں ۸ جنوری کے شہدا کا تذکرہ کرتے ہوئے۔ کئی مقامات پر سہواً ۱۹۵۳ء کی بجائے ۱۹۵۲ء کا سال درج ہوگیا ہے۔ قارئین کرام تصحیح فرمالیں۔

(ادارہ)

"صالحین" کو سامراجیوں کی اخلاقی امداد

امیر جماعت اسلامی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی جو حالیہ انتخابات میں ذلت آمیز شکست کے بعد سے اب تک منقار زیرِ پر تھے، اب پھر بولنے لگے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔ "انتخابات میں جماعت اسلامی کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی ہے نشستیں حاصل کرنا جماعت کا مقصد نہ تھا۔" (حریت ۱۲ جنوری)

جماعت اسلامی کا مقصد اگر نشستیں حاصل کرنا نہ تھا تو اُن کے امیدواروں نے کیا انتخابات میں اپنی ضمانتیں اس لئے داخل کی تھیں کہ ضبط ہو جائیں۔؟ مقصد اگر یہی تھا تو ماننا پڑے گا کہ جماعت اسلامی کو واقعی "زبردست کامیابی" حاصل ہوئی ہے۔ صوبائی انتخابات میں جماعت اسلامی کے ۲۰۸ میں سے ۱۷۰ امیدوار اپنی ضمانتیں ضبط کروا بیٹھے اور پنجاب میں جہاں "صالحین" کو اپنی طاقت کا بڑا زعم تھا۔ جماعت اسلامی کو صرف ایک فیصد ووٹ ملا۔ اب مودودی صاحب اپنے حواریوں کو یہ مژدہ سناتے ہیں کہ جماعت اسلامی نے پورے ملک سے ۲۵ لاکھ ووٹ کمائے ہیں۔ لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ انتخابات میں تقریباً ۹۰ فیصد ووٹروں نے جماعت اسلامی کے خلاف ووٹ ڈالا۔ اور وہ جماعت جو اپنے مخالف ۹۰ فیصد ووٹروں کی رائے کو بھی اہمیت نہیں دیتی بلکہ اپنی "زبردست کامیابی" کا ڈھنڈورا پیٹتی ہے، وہ یا تو پرلے درجے کی احمق اور ہٹ دھرم ہے یا نازی پروپیگنڈے کی ٹیکنیک استعمال کررہی ہے کہ جھوٹ بولو تو بڑے سے بڑا اور پھر دھڑتے سے، تاکہ اس کا اثر ہو۔ لیکن مودودی صاحب کی گمراہ کن سیاست کا اب تک کیا اثر ہوا ہے جو آئندہ ہوگا۔ عوام کا سیاسی شعور اپنے تجربوں کی بنیاد پر اتنا پختہ ہو چکا ہے کہ وہ دوست اور دشمن میں تمیز کرنے لگے ہیں۔

دراصل مولانا مودودی کو اپنے کارکنوں کے اجتماع میں اس گرم گفتاری کی ہمت حالیہ واقعات کی بنا پر ہوئی ہے۔ صالحین کو کسی برطانوی مصنف کی ایک پرانی کتاب کا نسخہ ہاتھ لگا ہے۔ جس میں پیغمبر اسلام کی شانِ اقدس میں گستاخانہ کلمات درج ہیں۔ قطعِ نظر اس کے کہ کوئی غیرت مند مسلمان اس نوع کی اشتعال انگیزی کو برداشت نہیں کرسکتا، بجا طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس پرانی کتاب کی دریافت، اس کے بارے میں ایک پمفلٹ کی اشاعت اور تقسیم اور پھر اسے بنیاد بنا کر توڑ پھوڑ اور لوٹ مار کی کارروائی شہر شہر اور قریہ قریہ شروع کرنے کا آخر کیا جواز تھا؟ اس کے دو ہی مقصد ہو سکتے ہیں۔ اوّل، اشتعال انگیز نعروں کی مدد سے خود کو "محافظِ اسلام" ثابت کرنا اور شکست کا داغ پیشانی سے مٹا کر برسرِ عام آنا۔ دوسرے امنِ عامہ کے لئے خطرہ پیدا کرنا، تاکہ اقتدار کی پُرامن منتقلی ممکن نہ رہے اور انتخابات کے نتائج کالعدم ہو جائیں۔

صالحین اگر محض یہ چاہتے ہیں کہ عوام کے فرقہ وارانہ جذبات مشتعل کئے جائیں۔ انہیں توڑ پھوڑ اور تشدد کی راہ پر ڈال دیا جائے اور ملکی مسائل پر ٹھنڈے دل سے سوچنے اور اصل مطالبات کو لے کر آگے بڑھنے کے لئے سازگار ماحول باقی نہ رہے۔ پھر تو اور بات ہے۔ ورنہ لائقِ غور مسئلہ اور ہے۔ آج جس کتاب کے مندرجات پر احتجاجی مظاہروں کا سلسلہ جاری ہے۔ وہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب نہیں۔ یورپی اور امریکی مصنف اس نوع کی جسارت پہلے کر چکے ہیں۔ اور احتجاج کی بازگشت ہمارے یہاں پہلے بھی سُنی جاچکی ہے۔ یہ بات بھی طے ہے کہ امریکہ، برطانیہ اور بیشتر یورپی ملکوں میں اس مفہوم کا کوئی ضابطہ موجود نہیں جس کے تحت کتاب و رسائل کی اشاعت پر پابندی لگائی جاسکے یا اشاعت سے پہلے اُن کے مندرجات سے قابلِ اعتراض حصے حذف کئے جاسکیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مغرب کے یہی سامراجی ملک مدّتِ دراز سے ضمیر، عقیدے اور مذہب کی آزادی کے چیمپئن، مسیحیت اور اسلام کے "مشترکہ مقاصد" کی تکمیل کے دعویدار، اسلام کے دوست اور کمیونزم کے "بے خدا نظام" کے سب سے بڑے دشمن بنے رہے ہیں۔ لیکن آج تک اشتراکی ملکوں میں ایسی کتابیں اور مضامین کبھی شائع نہیں ہوئے جن میں حضور رسولِ مقبولؐ یا بزرگانِ دین کے باب میں کوئی نازیبا کلمہ درج ہوا ہو۔ بلکہ کسی بھی مذہب کے پیشوا کے متعلق گستاخانہ کلمات درج نہیں ہوئے۔ اس کے برعکس کوئی مہینہ ایسا نہیں گذرتا۔ جب امریکہ، برطانیہ یا ان کے کسی اور حلیف ملک سے مسلمانوں کے لئے کوئی نہ کوئی آزار دہ خبر نہ آتی ہو۔ کبھی کسی رسالے میں کوئی جعلی تصویر شائع ہو جاتی ہے۔ کبھی کوئی اشتعال انگیز مضمون چھپ جاتا ہے اور کبھی کسی کتاب کی اشاعت کا غلغلہ اٹھتا ہے۔ اشتعال انگیزی کی ان مسلسل وارداتوں کا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ مسلمان ملکوں میں فرقہ وارانہ جذبات ہمیشہ مشتعل رکھے جائیں۔ دراصل صالحین کے لئے سامراجی سرپرستی کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ مالی امداد الگ ہے اور "اخلاقی" امداد الگ ہے۔ سامراجی طاقتیں اگر اشتعال انگیز مواد پابندی کے ساتھ پاکستان میں درآمد کرتی رہیں تو صالحین کی جانب سے عوام کو یہ باور کرانے میں آسانی رہے گی کہ اسلام در واقعی خطرے میں ہے۔

"اسلام خطرے میں ہے" کا نعرہ حالیہ انتخابات میں ناکام ہو چکا ہے جذباتی نعرے اٹھانے اور اشتعال پھیلانے والوں کو بُری طرح شکست ہوئی ہے۔ لہٰذا "فوری امداد" کے طور پر

(باقی صفحہ ۴۲ پر ملاحظہ فرمالیں)



پٹرول کی مہنگائی نے جلتی پر تیل کا کام کیا ہے

شہری زندگی معطّل ہوگئی ٭ دو میل کا فاصلہ ہزار میل کا سفر بن گیا

مواصلات کے ساتھ ہر چیز مہنگی ہو جائے گی

آٹے، دال سبزی گوشت، گھی اور دوسری اشیائے صرف کی گرانی پہلے ہی کیا کم تھی کہ پٹرول کی قیمت بڑھ گئی۔ صارفین کے لئے یہ مہنگائی اونٹ کے کوہان پر آخری تنکا ثابت ہوئی۔ لاہور، کراچی، راولپنڈی، پشاور اور متعدد دوسرے شہروں میں رکشا اور ٹیکسی ڈرائیوروں نے ہڑتال کردی۔

ایک گیلن پٹرول پر ایک روپیہ اضافہ کی اطلاع سن کر ایک ٹیکسی ڈرائیور نے کہا۔ ویسے تو یہ بڑی اچھی بات ہے کہ حکومت نے طوفان سے متاثرہ آبادی کے لئے یہ ڈیوٹی لگائی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ پاکستان کی باقی آبادی جب اس اضافے سے متاثر ہوگی تو ان کی بحالی کے لئے ٹیکس کس پر لگایا جائے گا۔

بعض ٹیکسی اور رکشہ ڈرائیوروں کا فوری ردِ عمل یہ تھا کہ انہوں نے سواریوں سے من مانا کرایہ وصول کرنا شروع کردیا۔ اس سے شہر کے مختلف علاقوں میں ڈرائیوروں اور مسافروں میں تو تکار اور جھڑپ بھی ہوئی، لیکن معاملہ مکمل ہڑتال کے بعد گویا ٹل گیا۔ اب سڑکیں سنسان رہتی ہیں، پرائیویٹ گاڑیاں سڑکوں پر یک گونہ شانِ بے نیازی اور اس اطمینان کے ساتھ گزرتی ہیں کہ رکشاؤں اور ٹیکسیوں کا بدلا ان کی راہ کھوٹی کرنے کے لئے موجود نہیں۔ ہفتے اور اتوار کو تعلیمی ادارے اور بعض نجی دفاتر بھی بند رہے۔ شہر میں احتجاجی مظاہروں کی بنا پر یوں بھی ٹریفک کا زور کم رہا۔ البتہ پیر کا دن بالکل معطّل گذرا۔

ہوائی اڈے اور ریلوے اسٹیشن کے مسافر اور ہسپتال جانے والے مریض اب تانگوں اور گدھے گاڑیوں میں بھاری کرائے دے کر سفر کرتے ہیں۔ ہوائی اڈے سے ایک مسافر نے صدر کا کرایہ نجی گاڑی کے ایک ڈرائیور کو ۲۵ روپے ادا کیا ہے۔ تانگے والوں نے ناظم آباد، لیاقت آباد اور کھارادر تک کا کرایہ ۲۵ روپے، ۲۰ روپے اور پندرہ روپے تک وصول کیا ہے۔

اس مفہوم کی اپیلیں اگرچہ اخباروں میں شائع ہوئی ہیں کہ پرائیویٹ کاروں کے مالک، راہ گیروں، دفتر کے اہلکاروں، مریضوں اور طالب علموں کو لفٹ دینے میں فراخدلی سے کام لیں، اور دردمند لوگ، بشرطیکہ ان کے پاس فرصت ہو، اور راہ کھوٹی ہونے کا ڈر نہ ہو ان اپیلوں پر عمل بھی کرتے ہیں، لیکن شہروں میں ٹریفک کا مسئلہ، ظاہر ہے کہ تھوڑے سے کار ڈرائیوروں کی "لفٹ" سے حل نہیں ہو سکتا اور پھر اس صورت میں کہ ہزاروں رکشاؤں اور ٹیکسیوں کی موجودگی میں بھی، سواریوں کی ایک کثیر تعداد بسوں کے پائیدان پر لٹک کر سفر کرتی ہے۔

پٹرول کراچی میں کیوں مہنگا ہے؟

پٹرول کی گرانی یوں تو پورے ملک کے لئے ہے، لیکن کراچی کے لوگوں کو اس بارے میں حکومت سے خاص طور پر شکایت ہے۔ کراچی ایک بندرگاہ ہے۔ تیل کی ریفائنریاں یہاں کام کرتی ہیں۔ اکثر درآمدی اشیاء کی طرح پٹرول بھی کراچی سے ہی مغربی پاکستان کے دوسرے حصّوں کو مہیا کیا جاتا ہے، لیکن عجب بات ہے کہ باربرداری کا کرایہ شامل کرنے کے بعد بھی پٹرول کی قیمت کراچی اور دوسرے علاقوں کے درمیان یکساں ہے۔ حالانکہ اصولاً کراچی میں پٹرول کو سستا ہونا چاہیئے۔ سستا تو کیا ہوتا اب اسے اور مہنگا کردیا گیا ہے۔

کراچی فاصلوں کا شہر ہے، یہاں کی کاروباری اور تمدّنی زندگی کا انحصار مواصلات کے ذرائع پر ہے۔ اور یہ ذرائع پٹرول کے بغیر معطّل ہو جاتے ہیں، اب سے دس پندرہ سال پہلے، پٹرول کی مہنگائی کے لئے یہ جواز پیش کیا جاتا تھا کہ پٹرول نادار اور متوسط لوگوں کے استعمال کی چیز نہیں، اس سے تو صرف کاروں والے اور بڑے بڑے ٹرانسپورٹر متاثر ہوں گے، لیکن اس عرصے میں پٹرول نے غیر محسوس طور پر کراچی اور دوسرے بڑے شہروں کی زندگی میں رگِ حیات کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ آمد و رفت کے علاوہ، باربرداری کا سارا نظام پٹرول سے چلنے والی گاڑیوں کے سہارے قائم ہے۔ پٹرول کی مہنگائی کے ساتھ ہی جہاں آمد و رفت کے کرائے بڑھ جائیں گے، وہیں کاروباری لوگ باربرداری کا زائد صرفہ خود برداشت کرنے کی بجائے اسے بھی صارفین کے سروں پر تھوپ دیں گے۔ لامحالہ گوشت، سبزیاں، دودھ، پھل اور اجناس مہنگی ہوں گی۔

پورے پاکستان میں جس قدر کاریں رجسٹر ہوئی ہیں، ان کی ۵۰ فیصد سے زائد تعداد صرف کراچی میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پٹرول پر ایک روپیہ فی گیلن ڈیوٹی لگنے کے بعد کل رقم کا ساٹھ فیصد محض کراچی کے شہریوں سے وصول کیا جائے گا۔ یہاں یہ امر قابل توجہ ہے کہ پاکستان میں پٹرول کی قیمت، دنیا کے بیشتر علاقوں مثلاً مغربی یورپ، مشرقِ وسطیٰ، جنوب مشرقی ایشیا اور امریکہ سے کہیں زیادہ ہے۔

قیمتوں میں اضافہ کو "کمی" کا نام دے کر عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکی جا رہی ہے

حکومت کی طرف سے بار بار گرانی کے رجحان پر تشویش کا اظہار کیا جا رہا ہے لیکن اس کے انسداد کے لئے ابھی تک موثر اقدامات نہیں کئے گئے سوائے اس کے کہ بناسپتی گھی کے دام مقرر کر دیے گئے ہیں جن پر ہر حلقے کی جانب سے سخت تنقید کی جا رہی ہے۔ یہ تنقید اس لئے حق بجانب ہے کہ "قیمت میں کمی" کے نام پر جو قیمت مقرر کی گئی ہے وہ پرانے نرخ سے تقریباً ۴ پیسہ فی پونڈ زیادہ ہے۔ بناسپتی گھی کی مقررہ قیمت درج ذیل ہے۔

۲ پونڈ	۵٫۳۰	روپے فی ٹن
۵ پونڈ	۱۲٫۸۷	روپے فی ٹن
۱۰ پونڈ	۲۵٫۰۰	روپے فی ٹن
۳۵ پونڈ	۸۴ر۳۵	روپے فی ٹن
فی پونڈ	۲٫۴۱	روپے

۲ر جنوری کو حکومت کی جانب سے ایک پریس نوٹ جاری کیا گیا جس میں مندرجہ بالا قیمتوں کا اعلان کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ قیمتوں میں اس "کمی" کو ممکن بنانے کے لئے مرکزی حکومت نے جنوری سے جون ۷۱ء تک محصول میں دو سو روپے فی ٹن کے حساب سے کمی کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

بناسپتی کے نرخ میں اس "کمی" کے علاوہ گذشتہ ۲۳ سال کے عرصے میں بیشتر اشیاء صرف کے داموں میں کئی سو فیصد کا اضافہ ہوا ہے جبکہ آمدنی میں اضافہ کا تناسب نہایت قلیل ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق۔ پچھلے بیس سال کے دوران پورے ملک میں چاول کی قیمت میں اوسطاً دو سو فیصد آٹے کی قیمت میں تقریباً ڈھائی سو فیصد مچھلی اور گوشت کی قیمت میں تقریباً پانچ سو فیصد، چائے میں اوسطاً تین سو فیصد، دال کی قیمت میں اوسطاً ڈھائی سو فیصد اور ایندھن میں تقریباً چار سو فیصد اضافہ ہوا ہے، یہ اعداد و شمار مختلف سماجی اداروں کے سروے کی روشنی میں پیش کئے جا رہے ہیں۔

بناسپتی کم قیمت پر فروخت ہوا

بناسپتی گھی کی قیمتوں میں اچانک اضافے کے اسباب میں سب سے بڑا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ آئل ملز کے مالکوں نے ایک باضابطہ منصوبے کے تحت سپلائی روک دی تھی۔ اس اقدام سے ان صنعت کاروں کا مقصد یہ تھا کہ دام ایک دم اتنے بڑھا دیے جائیں کہ حکومت بڑھے ہوئے داموں میں سے کم از کم نصف پر راضی ہو جائے۔ چنانچہ ۲۳ روپے میں فروخت ہونے والے دس پونڈ کے ڈبے کی قیمت اچانک ۲۸ روپے کر دی گئی۔ اور پھر حکام بالا کو اپنی "مجبوریاں" بتا کر دس پونڈ کے ڈبے کی قیمت ۲۳ روپے کے بجائے ۲۵ روپے مقرر کرائی گئی اور اس اضافہ کو "کمی" کا نام دے کر عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کی گئی۔ یہی نہیں بلکہ چالاک صنعت کاروں نے حکومت سے فی ٹن دو سو روپے محصول بھی کم کروا لیا۔ یہ دو طرفہ فراڈ ہے جس میں ایک طرف عوام اور دوسری طرف حکومت کو دھوکہ دیا گیا ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ متعلقہ محکمہ جس کے سپرد قیمت اور لاگت وغیرہ کی چھان بین کی ذمہ داری ہے یا تو انتہائی نااہل ہے یا پھر صنعت کاروں سے اس کا گٹھ جوڑ ہے۔

اس شرمناک ڈرامہ کی تصدیق یوں بھی ہو جاتی ہے کہ ۱۸ر جنوری کو مارکیٹ میں ۳۵ پونڈ گھی کا ڈبہ ۷۵/۰ روپے میں فروخت ہو رہا تھا جبکہ حکومت کی کم کی ہوئی قیمت ۸۴ر۳۵ ہے۔ کراچی کے ہول سیل ڈیلروں نے بتایا کہ قیمتوں میں اضافہ اکثر صنعت کاروں کی سازشوں سے ہوتا ہے۔ صنعت کار اچانک سپلائی روک کر یا اس میں کمی کر کے قلت کا ایک مصنوعی بحران پیدا کر دیتے ہیں اور پھر دونوں ہاتھوں سے عوام کو لوٹتے ہیں۔ دو سو ٹن رکھ کر تجارت کرنے والے ان بیوپاریوں کا کہنا ہے کہ قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کے اس کھیل میں بہت سارے چھوٹے کاروباری اکثر نقصان اٹھاتے رہتے ہیں۔ ہر حال میں فائدہ صنعت کاروں کو ہوتا ہے۔

صنعت کاروں سے باز پرس کیوں نہیں؟

پنجاب میں سہگل خاندان کی کوہ نور آئل ملز کی اجارہ داری ہے جو تقریباً سارے پنجاب کو بناسپتی سپلائی کرتے ہیں اور کراچی میں برما آئل ملز، وزیر علی انڈسٹریز، بنگال ویجیٹیبل انڈسٹریز، حیدری انڈسٹریز، مقبول کمپنی، بیور برادرس وغیرہ گھی بنانے والے ہیں۔

جب تک حکومت نے پیداوار کی مقدار کی بنیاد پر ٹیکس لگایا ان صنعت کاروں نے اصل پیداوار سے نصف دکھا کر حکومت کو دھوکہ دیا اور ٹیکس بچایا اور جب حکومت نے کیپیسٹی ٹیکس نافذ کیا تو صنعت کاروں نے نوکر شاہی سے مل کر اپنے کارخانوں کی پیداواری صلاحیت کو نصف کے قریب گھٹا کر دکھانا شروع کیا۔ اس طرح اپنی پیداوار پر صنعت کار ہمیشہ دو اور تین سو فیصد نفع کماتے رہے۔ یہ ایسے کھلے حقائق ہیں جن سے حکومت یقیناً ناواقف نہ ہوگی۔ لیکن حیرت ہے کہ اس سلسلے میں صنعت کاروں سے باز پرس کرنے کے بجائے انہیں اور زیادہ سہولتیں مہیا کی جاتی رہیں اور یہی رجحان اب تک جاری ہے۔

کریانہ کے خوردہ فروشوں کی تنظیم (کراچی گروسرز گروپ) کے جنرل سیکریٹری جناب محمد طاہر خاں نے کہا ہے کہ حکام اور مل مالکوں کے باہمی تبادلۂ خیال کے بعد بناسپتی گھی کی جو قیمت مقرر کی

اشیائے صرف کی بڑھتی ہوئی قیمتوں پر ایک نظر

قیمتوں کا یہ جائزہ حکومت کے مرکزی دفتر اعداد و شمار کے مطابق ہے۔ صارفین کا کہنا ہے کہ عام طور پر اشیاء کی قیمتیں سرکاری اعداد و شمار سے زیادہ ہی ہوتی ہیں۔ (نیچے دی ہوئی قیمتیں فی سیر ہیں)

اشیاء	۴۹ - ۵۰ء	۵۸ - ۵۹ء	ستمبر ۶۹ء	ستمبر ۷۰ء	دسمبر ۷۰ء
آٹا گندم	۰٫۳۳	۰٫۳۳	۰٫۴۱	۰٫۴۶	۰٫۴۶
چاول کنگنی	۰٫۳۳	۰٫۵۲	۰٫۷۶	۰٫۷۰	۰٫۶۸
مونگ دھلی	۰٫۵۲	۰٫۹۱	۱٫۷۹	۱٫۷۵	۱٫۶۸
چنا	۰٫۳۱	۰٫۴۷	۱٫۱۸	۰٫۹۱	۰٫۸۷
گوشت چھوٹا	۱٫۵۹	۳٫۳۱	۵٫۰۰	۶٫۰۰	۷٫۰۰
گوشت بڑا	۰٫۴۰	۱٫۲۲	۲٫۵۰	۳٫۰۰	۳٫۱۰
آلو	۰٫۳۹	۰٫۴۴	۱٫۰۰	۱٫۰۸	۰٫۶۲
پیاز	۰٫۳۶	۰٫۳۶	۰٫۴۹	۰٫۳۱	۰٫۴۱
گھی بناسپتی (کھلا)	۲٫۲۲	۳٫۵۶	۴٫۴۰	۴٫۷۵	۵٫۴۴
گائے کا دودھ	۰٫۶۲	۰٫۶۴	۱٫۲۵	۱٫۳۵	۱٫۳۵
بھینس کا دودھ	۰٫۶۲	۰٫۶۴	۱٫۲۵	۱٫۳۵	۱٫۳۵
شکر	۰٫۹۵	۱٫۳۱	۱٫۷۵	۱٫۷۵	۱٫۷۵

گئی ہے وُہ انتہائی نامناسب ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ دس پونڈ کے ڈبے کی زیادہ سے زیادہ قیمت اٹھارہ روپے ہونی چاہئیے طاہر خاں نے بتایا کہ آج سے تقریباً دو ماہ قبل دس پونڈ کے ڈبے کی قیمت اکیس روپے ۵۰ پیسے تھی اور مارکیٹ میں گھی کی کوئی قلت نہ تھی لیکن مل مالکوں نے اچانک قیمت بڑھا کر اپنی تجوریاں خوب بھر لیں اور غریب عوام کی پریشانیوں میں اضافہ کر دیا۔ حکومت کے فی ٹن دو سو روپے محصول کم کرنے کے بعد دس پونڈ کے ڈبے کی قیمت اٹھارہ روپے سے کسی طرح زیادہ نہیں ہونا چاہئیے۔

ہمارے ملک میں چینی اب اتنی مقدار میں پیدا ہو رہی ہے کہ ہمیں اب چینی درآمد کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ملک کی برآمدات بڑھانے کے لئے بونس کا لالچ دے کر بنیادی ضرورتوں کی اشیاء کو انتہائی سستے داموں بیرونی ملکوں میں بھیجنے کا جو سلسلہ شروع کیا گیا ہے اس کے نتیجے میں شوگر ملوں کے مالکان ایس (۱۹) روپے من کے حساب سے چینی برآمد کر رہے ہیں، یہی کچھ حال باسمتی کا ہے، ان وجوہ کے نتیجے میں بیرونی ملکوں کو سات آنے میں فروخت کی جانے والی چینی ملک کے غریب عوام کو ایک روپیہ بارہ آنے سیر میں خریدنی پڑ رہی ہے۔ درآمد و برآمد کی ناقص پالیسیوں اور مقامی صنعت کاروں کی ہوسِ زرگری کو روکنے کے لئے سخت تدابیر اختیار کرنا ضروری ہے۔

گرانی سے عوام میں جو بے چینی پیدا ہو گئی ہے اس کا اندازہ مختلف سیاسی، سماجی جماعتوں کی طرف سے شائع ہونے والے ان بے شمار بیانات سے بھی ہوتا ہے جو ہر روز اخباروں میں چھپ رہے ہیں بعض سیاسی جماعتوں کی طرف سے گرانی کے خلاف مظاہروں وغیرہ کے پروگرام بنائے جا رہے ہیں یہ صورتِ حال ایسی ہے کہ اگر بروقت اس پر غور نہ کیا گیا تو حالات حکومت کے بس سے باہر ہو سکتے ہیں۔

آمدنی میں اضافہ مہنگائی کے بوجھ تلے دب کر دم توڑ چکا ہے

قدوس صاحب لانڈھی کالونی میں رہتے ہیں۔ کوئی دس سال سے ایک کاٹن ملز میں کام کر رہے ہیں۔ انہوں نے بحیثیت فٹر میکانک کام شروع کیا۔ ابتداً ساڑھے چار روپے یومیہ ملتے تھے۔ دس سال میں ان کی یومیہ اجرت میں صرف ڈیڑھ روپیہ کا اضافہ ہوا ہے۔ سالانہ اجرت میں دو آنے کا اضافہ بھی اس میں شامل ہے۔ دس سال پہلے ان کا خاندان ۷ افراد پر مشتمل تھا۔ اس میں بیوی، تین لڑکے، ایک لڑکی اور بوڑھے والد شامل ہیں۔ دس سال قبل ساڑھے چار روپے یومیہ میں سات افراد کے کنبے کا انتہائی مشکل سے گزر ہوتا تھا۔ ہنگامی ضرورتوں کے لئے ہمیشہ قرض کا سہارا لینا پڑتا تھا، غذا میں سبزی، دال، روٹی اور ہفتے میں دو ایک بار پاؤ بھر گوشت انہیں نصیب ہوتا تھا، دودھ، انڈے یا مچھلی کا استعمال مہینوں میں ایک آدھ بار بمشکل ہوتا تھا، تعلیمی اخراجات کا بندوبست ان حالات میں ممکن نہ تھا، لہٰذا ان کا کوئی بچہ تعلیم حاصل نہ کر سکا۔

قدوس صاحب کا کہنا ہے کہ میں نے آمدنی میں اضافے کے لئے اپنے گیارہ سالہ لڑکے کو ایک گیراج میں بطور ہیلپر لگا دیا۔ آج لڑکا اسی گیراج میں تین سو روپے ماہوار پا رہا ہے ان کے افراد خاندان میں تین بچوں کا اضافہ اور ایک کی کمی ہوئی ہے (والد کا انتقال ہو چکا ہے) اس طرح اب ان کا خاندان نو افراد پر مشتمل ہے ان کی اپنی تنخواہ تقریباً ایک سو پچاس روپے ہے۔ گھر میں لڑکے کی تنخواہ تین سو روپے آتی ہے اس طرح ان کی آمدنی دس سال پہلے کے مقابلے میں دو سو فیصد بڑھ گئی ہے۔ لیکن ان کا کہنا ہے کہ معیارِ زندگی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔ آج بھی وُہ اسی طرح کے کپڑے پہنتے ہیں جس طرح دس سال قبل پہنتے تھے وہی دال روٹی اور کبھی کبھار گوشت آج بھی ان کی غذا ہے۔ ہنگامی ضرورتوں کے لئے آج بھی ان کے پاس کوئی بچت موجود نہیں۔ ان کی ایک لڑکی شادی کے قابل ہو چکی ہے لیکن مالی حالت ایسی نہیں کہ قرض کے بغیر بچی کی شادی کا انتظام کر سکیں، ان کا کہنا ہے کہ ان کی مجموعی آمدنی میں دو سو فیصد کا اضافہ پانچ سو فیصد گرانی کے بوجھ میں دب چکا ہے۔

ماجد علی صاحب ایک نیم سرکاری ادارے میں ملازم ہیں۔ دس سال پہلے وہ ایک بنک میں کام کرتے تھے۔ گریجویٹ ہیں۔ پہلے ڈھائی سو روپے ملتے تھے۔ اس وقت کل ۷ افراد ان کے زیرِ کفالت تھے۔ اِن میں والدہ دو بہنیں، دو بھائی

صنعتکاروں کے ساتھ نوکر شاہی کا گٹھ جوڑ ختم کیا جائے مہنگائی ختم ہو جائے گی

اور والد شامل تھے۔ ڈھائی سو روپوں میں بڑی مشکل سے گذر بسر ہوتا تھا۔ اس دوران اپنے والد کے کلیم کے عوض حاصل ہونیوالی رقم سے انہوں نے دونوں بہنوں کی شادی کردی۔ پھر اپنی شادی کی، ایک بھائی ملازمت کے بعد علیحدہ ہو چکے ہیں۔ ان کے دو بچے ہیں اس طرح ان کا خاندان وہی سات افراد پر مشتمل ہے چار سال قبل انہیں جس ادارے میں ملازمت ملی وہاں ان کی تنخواہ چار سو روپے مقرر ہوئی۔ پچھلے دو سال سے وُہ اوور ٹائم بھی کر رہے ہیں ان کا چھوٹا بھائی ایک فرم میں جُز وقتی کام کرتا ہے اس طرح اسوقت ان کی مجموعی آمدنی چھ سو روپے کے قریب ہے لیکن ان کا کہنا ہے کہ ان کی آمدنی میں اس دوران جو اضافہ ہوا وُہ مہنگائی کے بھینٹ چڑھ گیا نہ دس سال پہلے کے مقابلے میں آج انہیں اچھا کپڑا میسّر ہے نہ اچھی غذا، نہ کوئی بچت ہوتی ہے۔ اس عرصہ میں پراویڈنٹ فنڈ کی جو رقم جمع ہوئی ہے اسے حاصل کر کے وُہ اپنے بھائی کی شادی کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔

الیاس احمد سلیم صاحب کی عمر کوئی ۴۲ سال ہے۔ وہ ایک صنعتی ادارے میں شفٹ انچارج ہیں۔ دس سال قبل آپ کی آمدنی تقریباً تین سو روپے ماہوار تھی۔ اس وقت وہ اپنے خاندان کے واحد کفیل تھے جو پانچ افراد پر مشتمل تھا، اب ان کی آمدنی جس میں ان کے صاحبزادے سعید احمد کی آمدنی بھی شامل ہے تقریباً ساڑھے چھ سو روپے ہے۔ آپ کا کہنا ہے کہ ان دس برسوں میں دو بچوں کا اضافہ ہوا ہے لیکن آمدنی میں دُگنے اضافے کے باوجود اِن کے معمولات اور معیارِ زندگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ کھانے اور لباس کا معیار جو آج سے دس سال پہلے تھا وہی اَب بھی ہے، البتہ وہ اپنے دو بچوں کو تعلیم دلوا رہے ہیں۔ شدید کفایت کے باوجود وہ کوئی رقم پس انداز نہیں کر پاتے بلکہ بعض وقت قرض کی نوبت آجاتی ہے جو ایک مستقل بوجھ بن کر رہ جاتا ہے۔

عبدالرزاق صاحب ایک نیم سرکاری ادارے میں مُلازم ہیں ان کی عمر ۴۰ سال کے قریب ہے لیاقت آباد میں رہتے ہیں موصوف کا کہنا ہے کہ وہ کوئی بارہ سال قبل اس ادارے میں بحیثیت جونیئر کلرک بھرتی ہوئے تھے میٹرک پاس ہیں۔ انہیں بارہ سال پہلے ایک سو بیس روپیہ تنخواہ ملتی تھی بارہ سال کی مُسلسل غلامی کے بعد اب وہ جونیئر کلرک سے سینئر کلرک ہوئے ہیں اور تنخواہ میں کوئی پچاس روپے کا اضافہ ہوا ہے۔ ان کا خاندان بارہ سال پہلے پانچ افراد پر مشتمل تھا، اس پورے بارہ سال کے عرصے میں انہوں نے دودھ کا استعمال صرف چائے میں کیا ہے۔ ان کے کسی بچے کو خالص دودھ میسّر نہیں آیا۔ بڑا گوشت ہفتے میں تین چار بار صرف پاؤ بھر آتا ہے۔ ان کے افراد خاندان کی تعداد اب ۹ ہے ایک لڑکا قالین بنانے کا کام کرتا ہے انہوں نے اپنی بڑی صاحبزادی کے تعلیمی شوق کے پیش نظر خود بچوں کو ٹیوشن پڑھا کر اپنی لڑکی کی تعلیم جاری رکھی اور میٹرک کے بعد ٹی سی کروایا۔ ان کی صاحبزادی ایک پرائیویٹ اسکول میں مُلازم ہیں، جہاں اسّی روپے ماہوار تنخواہ ملتی ہے، حالانکہ دستخط زیادہ رقم پر لئے جاتے ہیں۔ اب ان کی مجموعی آمدنی سوا تین سو روپے کے قریب ہے لیکن آج بھی ان کے یہاں روزانہ صرف پاؤ بھر دودھ آتا ہے جو چائے میں استعمال ہوتا ہے ہفتے میں تین چار بار پاؤ بھر بڑا گوشت آتا ہے اور وہی موٹا جھوٹا کپڑا پہنتے ہیں جو بارہ سال پہلے پہنا کرتے تھے۔ رزاق صاحب نے بڑے دُکھ سے کہا کہ اوّل تو لڑکی کی شادی کے لئے میرے پاس پھوٹی کوڑی نہیں دوسرے میں خود غرض یہ سوچتا ہوں کہ لڑکی کی شادی ہوجائے گی تو ہر ماہ اسّی روپے کی جو کمی ہوگی اسے میں کس طرح پورا کروں گا۔ رزاق صاحب کا کہنا ہے کہ ابھی حال ہی میں اشیاءِ صرف کے جو دام بڑھے ہیں اس کی وجہ سے انہیں گوشت کے آئیٹم کو غذا سے یکسر خارج کرنا پڑا ہے۔ اس کے باوجود انہیں ہر مہینے پندرہ بیس روپے اُدھار لینے پڑیں گے۔

مہنگائی کے خاتمے کی تجویزیں

یوں تو پاکستان میں مہنگائی ۲۳ سال سے مسلسل گھن کی طرح عوام کو چاٹ رہی ہے لیکن پچھلے دنوں اس میں اچانک جو حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے اس نے عوام کی زندگی کو زیروزبر کر کے رکھ دیا ہے۔ ایوب حکومت کے آخری دنوں میں تنخواہوں اور اجرتوں میں معمولی سا اضافہ ہوا تھا۔ اس کی قیمت عوام کو سو سے لے کر دو سو فی صد تک مہنگائی کی شکل میں بھگتنا پڑ رہا ہے۔

گرانی میں اضافہ کی کئی ایک وجوہ ہیں جنہیں ناقص اقتصادی منصوبہ بندی معیشت اور صنعت کا ایک ہی ہاتھوں میں چلا جانا غیر ملکی قرضوں کا بڑھتا ہوا سود، افراطِ زر (حکومت نے صرف موجودہ بجٹ کے فائدے کو پورا کرنے کے لئے ۹۰ کروڑ کے نوٹ چھاپے ہیں) بونس واؤچر سسٹم جس کے تحت اشیاء صرف اصل لاگت سے کم پر برآمد کر دی جاتی ہیں جن میں چاول، چینی، پھل وغیرہ شامل ہیں، جہازوں کا مہنگا کرایہ، زرعی اجناس میں دلالوں کا کردار وغیرہ خاص طور پر شامل ہیں، سرمایہ دارانہ نظام میں چونکہ پیداوار برائے ضرورت کا اصول نہیں بلکہ پیداوار برائے منافع کا اصول کارفرما ہوتا ہے لہٰذا صنعت کار صرف ان چیزوں کی پیداوار پر زیادہ توجہ دیتا ہے جن میں اسے زیادہ منافع ملے بنیادی ضرورت کی اشیاء کے بجائے اشیاءِ تعیش کی چیزیں زیادہ تیار اور درآمد کی جاتی ہیں کیونکہ اس طبقے میں جس کے ہاتھوں میں دولت کے انبار ہوتے ہیں ان اشیاء کی مانگ زیادہ ہوتی ہے۔

یوں تو سرمایہ دارانہ سماج کی ان لعنتوں پر مستقل طور پر قابو پانا مشکل ہے۔ لیکن ماہرین معاشیات کے کہنے کے مطابق مندرجہ ذیل اقدامات سے وقتی طور پر مہنگائی کو روکا یا کم کیا جاسکتا ہے:۔

مالی خساروں کو پورا کرنے کے لئے زائد نوٹ نہ چھاپے جائیں، اشیاءِ خورد و نوش کی برآمد پر پابندی عائد کی جائے، زرعی معیشت سے مسود میانہ آدمی کو ختم کیا جائے، غیر ملکی قرضوں پر انحصار کم کیا جائے، بنیادی ضرورتوں کی اشیاء کی قیمتوں پر کنٹرول نافذ کیا جائے، اسٹاک کو روکنے والوں کے خلاف سخت کارروائی کی جائے بیوروکریسی اور صنعت کاروں سے گٹھ جوڑ ختم کیا جائے۔

بدلِ اشتراک

مغربی پاکستان کے لئے

سالانہ چندہ	۳۰ روپے
ششماہی	۱۶ روپے

مشرقی پاکستان کے لئے

سالانہ چندہ	۳۵ روپے
ششماہی	۱۸ روپے

نرخنامہ اشتہارات

پورا صفحہ	۵۰۰ روپے
آدھا صفحہ	۲۷۵ روپے
آخری صفحہ	۱۰۰۰ روپے
سرورق کا دوسرا صفحہ	۷۵۰ روپے
سرورق کا تیسرا صفحہ	۶۵۰ روپے

فارغ بخاری

غزل

نا روا کہتے یا روا کہتے　　جو بھی کہنا تھا برملا کہتے

ہر طرف ہو رہی تھیں تاویلیں　　ہم کسے تیرا نقشِ پا کہتے

کرتے کب تک نہ فکرِ چارہ گری　　درد کو دردِ لا دوا کہتے

زخم کھا کھلکے تابہ کے آخر　　دستِ قاتل کو مرحبا کہتے

شرط انصاف ہے کہ ہم شب کو　　شب نہ کہتے تو اور کیا کہتے

ہم اگر منکرِ خدا ہوتے　　تجھ سے کافر کو کیوں خدا کہتے

گہ ہی ہے تو شرم آتی ہے　　زندگی کو تری عطا کہتے

سچ تو یہ ہے کہ ہم غزل فارغ
میر و غالب کے بعد کیا کہتے

سبیر زیدی

آرلنگٹن سمیٹری

(ارلنگٹن سمیٹری، واشنگٹن (امریکہ) میں ایک قبرستان ہے۔ یہاں زیادہ تر گمنام سپاہی دفن ہیں۔ میں جب پہلی بار وہاں گیا تو شام کا وقت تھا اور کئی قبروں پر تازہ گلدستے رکھے ہوئے تھے یہ نظم اسی منظر سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے (مصنف)

نہ جانے کس نے رکھے ہیں یہ پھول تربت پر
نہ جانے کون ہے برسوں سے محوِ خواب یہاں
یہ پھول جن میں نمی ہے کسی کے اشکوں کی
یہ پھول اور یہ گمنام قبر کا پتھر
نہ جانے کتنے فسانوں کے رازداں ہوں گے
نہ جانے اِن کے فسانے کہاں کہاں ہوں گے

میں سوچتا ہوں کہ یہ نوجواں سپاہی جو
کسی کی آنکھ کا تارا کسی کا لختِ جگر
کسی کے دل کا قرار اور کسی کا نورِ نظر
میں سوچتا ہوں کہ اس نوجواں سپاہی نے
نہ جانے کون سے ایسے اصول کی خاطر
اجل کا جام پیا اور اجل کے ساتھ ہوا
مگر اسے کسی حاکم کی کجکلاہی نے
دیارِ غیر کو بھیجا وطن سے دور کیا

میں سوچتا ہوں کہ یہ جنگ اور یہ بربادی
کبھی نہ ختم ہوئی ہے نہ ختم ہوگی کبھی
تباہیوں کے صحیفے، یہ جنگ کی خبریں
یہ صف بہ صف مری حدِ نگاہ تک قبریں
یہ شہر شہر لپیٹیں گی اپنے دامن میں
اور اِن قبور مکینوں کے چاہنے والے
اسی طرح سے سجا کر حسین گلدستے
ہر اک شام کو آئیں گے حاضری دینے



شہید طلباء کی یاد میں

جلوس کا اجازت نامہ منسوخ کر دیا گیا۔

"ڈی سی مردہ باد" کے نعرے

۸ جنوری ۱۹۵۳ء پاکستان کی تاریخ کا المناک دن ہے، جب پاکستان کے اُفق پر پھیلتے ہوئے اندھیروں نے کراچی کے ۲۸ طلباء کو ڈس لیا تھا، ہر سال ۸ جنوری کو ملک بھر کے طلباء (اسلامی جمعیت طلباء نہیں)، پورے وقار اور احترام کے ساتھ جلسے اور جلوس کے ذریعہ شہید طلباء کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں اور اس مشعل کو جلائے رکھنے کا اعلان کرتے ہیں جسے شہید طلباء نے اپنے خون سے روشن کیا تھا۔

این ایس ایف کے کارکنوں نے امسال بھی ۸ جنوری کو "شہید ڈے" کا ایک جامع پروگرام تیار کیا تھا۔

این ایس ایف کی مرکزی کمیٹی کی ہدایت کے مطابق جامعہ اور شہر کے کالجوں میں ۸ جنوری کی صبح کو جلسے منعقد کئے گئے جن میں شہید طلباء کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ان مقاصد پر روشنی ڈالی گئی جس کے لئے وہ رائفلوں اور بندوقوں کی باڑھ کے آگے سینہ سپر ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ شدید مہنگائی کو روکنے، تعلیم سستی کرنے اور رسول اکرمؐ کی شان میں گستاخی کرنے والے مصنف کے خلاف قرارداد مذمت منظور کی گئی۔ طلباء امریکی و برطانوی سامراج مردہ باد اور طلباء، مزدور کسان اتحاد زندہ باد کے فلک شگاف نعرے لگاتے ہوئے پُرامن طور پر منتشر ہو گئے۔

این ایس ایف (رشید گروپ)، میمن مسجد بولٹن مارکیٹ سے نماز جمعہ کے بعد جلوس نکالنے والی تھی۔ آتشزنی اور توڑ پھوڑ کی وجہ سے کراچی کا مطلع صبح ہی سے دھواں دھواں تھا۔ اس نوع کے واقعات کا تیسرا دن تھا۔ یہودی نژاد برطانوی مصنف کی کتاب کے خلاف پورے شہر میں زبردست اشتعال پھیلا ہوا تھا لہذا اندیشہ تھا کہ طلبا کا منظم جلوس بھی کہیں محض ہلڑ بازی کرنے والوں کی شرکت سے منتشر نہ ہو جائے۔

این ایس ایف (رشید گروپ) کے اعلان کیمطابق کارکن اور طلباء ڈیڑھ بجے سے میمن مسجد بولٹن مارکیٹ پر جمع ہونے لگے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں بینز اور پلے کارڈ تھے جن پر تعلیم سستی کرو، مہنگائی ختم کرو، ہم ۸ جنوری کے شہید طلباء کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ ایشیا سرخ ہے، مصلحت یا جدوجہد، جدوجہد جدوجہد کے نعرے لکھے ہوئے تھے۔ نماز ختم ہونے کے بعد طلباء کی بہت بڑی تعداد فٹ پاتھوں اور سڑکوں پر جمع ہو چکی تھی، وہ فلک شگاف نعرے لگا رہے تھے اور اپنے مقید رہنما رشید حسن خان، انعام میرانی اور مزدور رہنماؤں کی رہائی کا مطالبہ کر رہے تھے اتنی دیر میں پولیس چوکی سے ایک سفید پوش اے ایس آئی نے آ کر اطلاع دی کہ "جلوس کا اجازت نامہ منسوخ کر دیا گیا۔ طلباء یہاں سے منتشر ہو جائیں"۔

طلبا کو پولیس کا مشورہ

اس اطلاع پر طلباء مشتعل ہو گئے اور اعلان کیا کہ "وہ ہر حالت میں جلوس نکالیں گے"۔ "وہ ہر سال جلوس نکالتے رہے ہیں اس سال بھی جلوس نکالیں گے اور اپنی روایت کے مطابق شہید طلبا کو خراجِ عقیدت پیش کریں گے۔ انتظامیہ نے عین وقت پر جلوس کا اجازت نامہ منسوخ کر کے سخت زیادتی کی ہے"۔ اس دوران میں کئی بار فوجی گاڑیاں اس طرف سے گزریں، پولیس کی خاصی بڑی تعداد ٹرکوں اور جیپوں میں لدی پھندی اس جگہ پہنچی جسے دیکھ کر طلباء بے قابو ہو گئے، مگر علاقے کے مجسٹریٹ اور انچارج کی بروقت مداخلت سے صورتِ حال بگڑنے سے بچ گئی، اور پولیس وہاں سے فوراً ہٹالی گئی۔ اسی دوران میں علاقہ مجسٹریٹ اور انچارج، پولیس چوکی سے نمودار ہوئے، اور این ایس ایف کے رہنما حسنین حیدر بخاری، شہریار مرزا، الطاف احمد اور نایاب نقوی کو صورتِ حال پر بات چیت کے لئے اپنے ساتھ پولیس چوکی لے گئے، مجسٹریٹ نے ان رہنماؤں کو آگاہ کیا کہ شہر میں دفعہ ۱۴۴ لگادی گئی ہے اور مخدوش صورتِ حالات کے پیشِ نظر جلوس کا اجازت نامہ منسوخ کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ وہ زیادہ سے زیادہ ایک اسٹریٹ میٹنگ کر کے منتشر ہو جائیں۔

طلباء منتشر ہونے پر مجبور تھے

این ایس ایف کے رہنماؤں نے اس بات پر سخت احتجاج کیا اور علاقہ مجسٹریٹ کو بار بار اپنے موقف سے آگاہ کرتے رہے، مگر علاقہ مجسٹریٹ اور انچارج نے جلوس نکالنے کی اجازت نہ دی۔ این ایس ایف کے رہنما اور کارکن موقع کی نزاکت اور سنگینی کو بھانپ چکے تھے۔ انہوں نے دانشمندی کا ثبوت دیتے ہوئے جلوس نہیں نکالا البتہ طلباء کو منتشر کرنے سے پہلے ایک جلسہ کیا جس سے شہریار مرزا، حسنین حیدر بخاری اور علی یاور نے خطاب کیا۔ ۸ جنوری کے شہداء کے مشن پر روشنی ڈالی گئی۔ این ایس ایف کے صدر رشید حسن خان کی رہائی، یونیورسٹی آرڈیننس کی تنسیخ اور وائس چانسلر اشتیاق حسین قریشی کی برطرفی کا مطالبہ کیا گیا۔ اس موقع پر "ڈی۔ سی ڈاؤن، ڈاؤن" کے پُرزور نعرے بھی لگائے گئے۔

اس سے قبل صبح دس بجے اسلامیہ کالج سے این ایس ایف کے رہنما کی قیادت میں ایک جلوس نکالا گیا تھا، جو برطانیہ کی نسلی امتیازات کی پالیسیوں کے خلاف نعرے لگاتا ہوا

برٹش کونسل پر اختتام پذیر ہوا۔ یہاں طلبا کو منتشر کرنے کے لئے پولیس نے لاٹھی چارج کیا۔ لیاری اور کھارادر کے اسکول کے بچوں پر پولیس نے میکلوڈ روڈ اسپنسر بلڈنگ کے سامنے لاٹھی چارج کر کے منتشر کر دیا۔

این ایس ایف (کاظمی گروپ) کی جانب سے ۳ بجے سہ پہر کو یوم شہدا کے سلسلے میں ریگل اسٹاپ صدر پر مظاہرے کا اور اس کے بعد جلوس کا پروگرام تھا۔ تین بجے کے قریب این ایس ایف کے کارکن سیاہ بینر اور پلے کارڈ لے کر جمع ہونے لگے تھے۔ پولیس کی بھاری جمعیت ٹرکوں اور جیپوں پر برابر گشت کر رہی تھی۔ جگہ جگہ لاٹھی چارج کیا جا رہا تھا اور ہجوم پر آنسو گیس کے شیل پھینکے جا رہے تھے۔ تشدد اور توڑ پھوڑ کے واقعات، اور پولیس کی دھما چوکڑی سے شہید ڈے کے سارے پروگرام درہم برہم ہو گئے تھے۔ سڑکوں پہ ٹوٹی ہوئی بوتلوں کی کرچیاں بکھری ہوئی تھیں کہیں کہیں فرنیچر اور کاغذ کے الاؤ دہک رہے تھے۔ دکانوں سے دھواں اُٹھ رہا تھا اور فٹ پاتھوں پر سہما ہوا ہجوم ڈری ڈری نگاہوں سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔

این ایس ایف کے کارکن ریگل کے اسٹاپ پر کھڑے ہوئے ابھی اپنا بینر اور پلے کارڈ کھول ہی رہے تھے کہ اچانک پولیس کی ایک بڑی تعداد اس جگہ پہنچ گئی، اور وارننگ دیئے بغیر طلبا پر لاٹھیاں لہراتی ہوئی پل پڑی۔ پولیس کی

اس اچانک کارروائی سے ہجوم میں بھگدڑ مچ گئی۔ این ایس ایف کے کارکنوں سے بینر اور پلے کارڈ چھین لیے گئے اور چار کارکنوں کو گرفتار کر لیا گیا، کچھ دیر کے بعد اس جگہ منتشر طلباء ایک بار پھر جمع ہو گئے۔ این ایس ایف کے صدر عبدالباری نے طلباء سے خطاب کرتے ہوئے پولیس اور انتظامیہ کے اس رویّہ کی مذمت کی اور طلباء کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ اسی دوران میں انتظامیہ مُردہ باد، طلباء عوام اتحاد زندہ باد، وائس چانسلر کو برطرف کرو، یونیورسٹی آرڈیننس ختم کرو، اساتذہ کے مطالبات پورے کرو کے نعرے بلند ہوتے رہے۔

یہ توڑپھوڑ بے سبب نہیں

اسلام پسند "اپنی زندگی کا ثبوت" دے رہے ہیں

چند روز پیشتر ایک انگریزی کتاب "ٹرکش آرٹ آف لو ان پکچرز" کی تقسیم کا انکشاف ہوا، جس میں پیغمبر اسلام حضور مقبولؐ کی ذاتِ گرامی کے باب میں انتہائی نازیبا کلمات درج ہیں۔ کتاب کے بارے میں خبروں کی اشاعت کے ساتھ ہی مغربی پاکستان کے مختلف شہروں میں احتجاج کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اسکولوں اور کالجوں کے طلباء اپنے غم و غصہ کا اظہار کرنے کیلئے شاہراہوں، سڑکوں اور گلیوں میں اُمنڈ آئے۔ احتجاج کا پہلا دن کسی حد تک پُرامن رہا۔ البتہ کہیں کہیں تشدد کے واقعات رونما ہوئے، لیکن ۷ اور ۸ جنوری کو مغربی پاکستان کے اکثر شہر تشدد، بدامنی اور انتشار کی لپیٹ میں آ گئے۔

کچھ کتاب کے بارے میں

ہنگامے شروع ہوتے ہی برطانوی قونصل کی جانب سے ایک وضاحت نامہ شائع کیا گیا کہ برطانیہ میں نشر و اشاعت کی مکمل آزادی ہے اور ایسا کوئی قانون نہیں جس کے تحت کسی کتاب کی اشاعت پر پابندی عائد کر دی جائے۔ وضاحت نامے سے یہ بھی انکشاف ہوا کہ متنازعہ کتاب نیویارک میں بہت عرصہ پہلے شائع ہوئی تھی۔

حکومتِ پاکستان کے جاری کردہ پریس نوٹ میں کہا گیا کہ "برطانیہ میں ایک ایسی کتاب شائع ہوئی ہے جس میں حضور مقبول صلعم اور قرآن پاک کے بارے میں اہانت آمیز کلمات درج ہیں۔ اس غیر ذمہ دارانہ کتاب کی اشاعت پر جتنی مذمت کی جائے کم ہے لیکن بعض عناصر کے تخریبی رویّہ کو حکومت برداشت نہیں کر سکتی جنہوں نے احتجاج کرنے کے لیے قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیا، تشدد کیا، پتھراؤ کیا، آگ لگائی اور سفارتی عملے اور عمارتوں کو نقصان پہنچایا۔"

برطانوی قونصل اور سرکاری پریس نوٹ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ کتاب بہت پہلے شائع ہوئی تھی، پاکستان میں اچانک اور ایک خاص موقع پر اس کا انکشاف کیا گیا۔ دوئم لوٹ مار اور تشدد میں ایک مخصوص مکتبۂ فکر سے تعلق رکھنے والے افراد ملوث تھے جو سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق ہنگاموں کو ہوا دے رہے تھے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ کتاب بہت پہلے چھپی تھی تو یکایک پاکستان کے بالخصوص مقبوضہ اور رجعت پسند اخبارات کی زینت کس طرح سے بنی، اور اس کے بعد اس کتاب کا سہارا لے کر جمعیت مشائخ پنجاب نے ایک انتہائی اشتعال انگیز پمفلٹ شائع کر کے کیوں تقسیم کرائی۔ آخر رجعت پسندوں کی جانب سے احتجاج کے پُرامن وسیلوں کو تشدد اور ہنگاموں میں تبدیل کرنے کی سازش کس مقصد کے لیے تھی؟

- احتجاج کے لیے کوئی مثبت قدم کیوں نہیں اُٹھایا گیا؟
- تشدد کے واقعات کو کیوں مُسلسل ہوا دی گئی؟
- سفارتی عملے اور عمارات کو کیوں نقصان پہنچایا گیا؟
- پتھراؤ کیوں کیا گیا، دکانوں کو آگ کیوں لگائی گئی۔
- مقبوضہ اور اسلام پسند اخبارات اس واقعہ پر رنگ آمیزی کر کے عوامی غیض و غضب کو کیوں بھڑکاتے رہے۔ کراچی کے ایک مقبوضہ اخبار نے ۹ جنوری کی اشاعت میں اچانک دوسری دل آزار کتاب کا انکشاف کس مقصد کے لیے کیا؟

ان ہنگاموں کے پیچھے کون تھے؟

اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ حالیہ ہنگامے، تشدد، لوٹ مار اور قتل و غارتگری کے واقعات کے پیچھے دراصل انتخابات میں شکست خوردہ عناصر، سامراجی ایجنٹ، سرمایہ داروں اور رجعت پسند سیاستدانوں کا ہاتھ ہے جو ناکامی کی کالکھ اپنے مُنہ سے پونچھ کر ایک بار پھر عوام کے سامنے آنا چاہتے ہیں اور رجعت پسند نعروں کی مدد سے اپنی چودھراہٹ بحال کرنے کے درپے ہیں اس کے علاوہ یہ لوگ اقتدار کی پُرامن منتقلی کو ہر صورت میں ناکام بنانے پر تلے بیٹھے ہیں۔ وہ اپنے ایجنٹوں کے ذریعے پُرامن احتجاجی جلسے اور جلوسوں کو خونریزی اور بد امنی میں تبدیل کر دینا چاہتے تھے۔

حالیہ انتخابات میں سب سے شدید ضرب فاشسٹ تنظیم جماعتِ اسلامی نے کھائی ہے، انتخابات سے قبل اس تنظیم نے مقبوضہ اور اسلام پسند اخبارات کے ذریعہ اپنی شاندار کامیابی کی ہوا باندھ رکھی تھی۔ لیکن انتخابات میں عوام کے ہاتھوں شرمناک شکست کھانے کے بعد جماعت کے لیڈر ایک نئی سازش کا جال بُنتے رہے اور بالآخر ان کی یہ سازش حالیہ ہنگامے اور تشدد آمیز واقعات کی صورت میں ظاہر ہوئی۔

روزنامہ آزاد اور مساوات کی اطلاع ہے کہ ان ہنگاموں اور توڑپھوڑ میں جماعت اسلامی کی ذیلی تنظیم ڈیموکریٹک یوتھ فورس اور اسلامی جمعیت طلباء کے غنڈہ عناصر پیش پیش تھے، جنہیں کارروائی کے لئے پہلے سے تیار کیا گیا تھا۔ انہوں نے شہریوں کے پرامن احتجاج کا رخ ہنگامے کی جانب موڑ دیا۔ اور اس کے ساتھ ہی نوجوان طالب علموں کی توجہ ان کی معاشی اور تعلیمی ناآسودگی سے ہٹا کر فرقہ وارانہ جذبات کی طرف موڑ دی۔

انتخابی محاذ سے پسپائی اختیار کرنے کے بعد رجعت پسندوں نے برطانوی کتاب کی آڑ میں اشتعال انگیزی کا جو طریقہ اختیار کیا تھا۔ اس کے نتیجے میں پورا ملک آتش فشاں بن جاتا، مگر عوام نے اس موقع پر بھی اپنے پختہ سیاسی شعور کا مظاہرہ کیا۔ رجعت پسندوں نے کس قبیل کے لوگوں کو اپنے ساتھ لیا تھا، اس کا اندازہ کراچی کے اخبارات کی رپورٹوں سے ہوتا ہے بیشتر حملہ شراب کی دکانوں پر ہوا اور توڑپھوڑ کرنے والوں کی اچھی خاصی تعداد بوتلوں کو لوٹنے کے درپے تھی، انہی میں سے بعض افراد شراب کے نشے میں دھت ہسپتال پہنچائے گئے۔

بعض سیٹھوں کی ہدایت پر غنڈہ عناصر نے دکانوں کو نذر آتش کرتے وقت بائیں بازو کے ایک رہنما کے حق میں بار بار نعرے لگا رہے تھے۔ اس طرح وہ پُرامن شہریوں کو یہ بات باور کرانا چاہتے تھے کہ ہنگاموں اور لوٹ مار میں بائیں بازو کی ایک پارٹی ملوث ہے۔ لیکن اُن کا یہ گھناؤنا ہتھکنڈہ بھی ناکام ہو گیا۔ بلکہ اس کارروائی سے عوام دشمنوں کی نشاندہی آسان ہو گئی۔

اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں کوئی مسلمان ہتک آمیز کلمات برداشت نہیں کر سکتا۔ لیکن ضرورت اس بات کی تھی کہ احتجاج کے تمام وسیلوں کو پُرامن رکھا جاتا۔ اور حکومت پاکستان پر زور دیا جاتا کہ وہ ان سامراجی ملکوں سے تجارتی اور سفارتی تعلقات منقطع کر لے اور اندرون ملک انہیں وسیع کاروباری مراعات دینی بند کر دے جن ملکوں سے مسلمانوں کی دلآزاری کے لئے ہمیشہ نیا شگوفہ چھوڑا جاتا ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ سازشی عناصر کی جانب سے اس قسم کے واقعہ کے سدّباب کے لئے کوئی ٹھوس اور مثبت قدم اٹھانے کا اشارہ تک نہیں کیا گیا اس کے برعکس کونے کھدرے میں دبکے ہوئے جماعت اسلامی کے تنخواہ دار ملازم اور سرمایہ داروں کے ایجنٹ اپنے منصوبے کے مطابق یکایک اپنے بلوں سے باہر نکل آئے اور انہوں نے عوام کے جذبات کو مزید مشتعل کر کے تشدد اور لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا۔



یونیورسٹی آرڈیننس کی مدد سے جمہوریت اہلیت اور آزاد خیالی کو جامعہ سے نکال دیا گیا۔

وائس چانسلر نے جامعہ میں اپنی شخصی آمریت کیسے قائم کی

شعبۂ تادیب وائس چانسلر کے آمرانہ ذہن کی پیداوار ہے

نعیم آروی

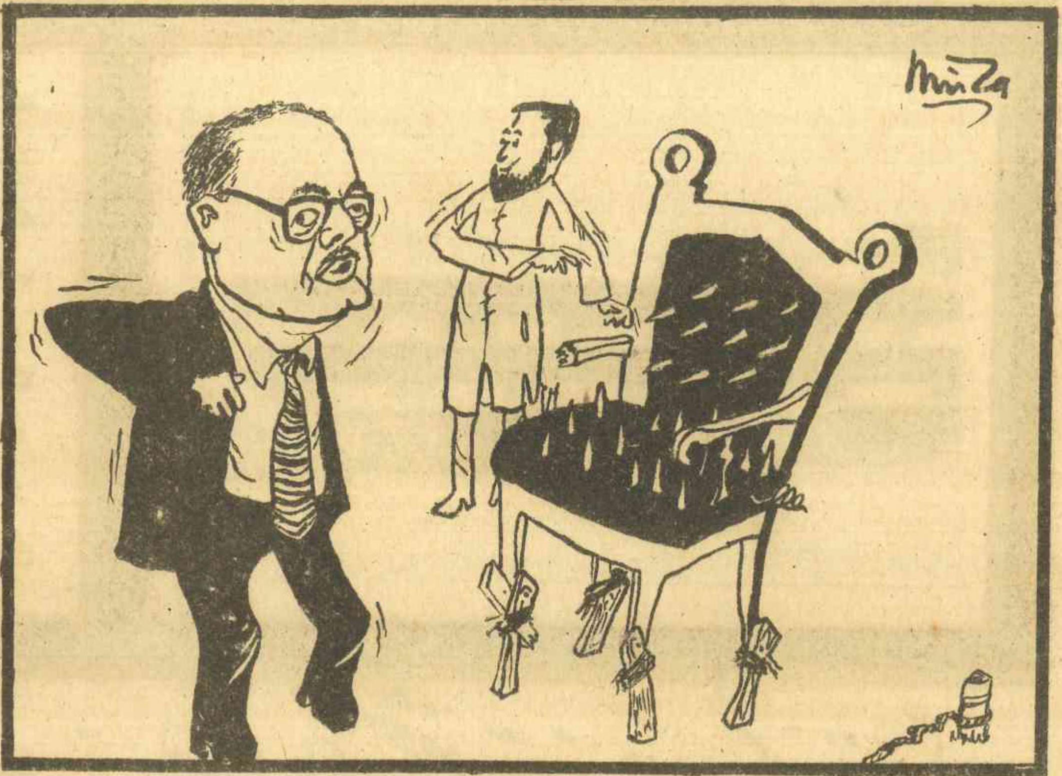
ایوب خاں نے اپنی آمریت کی بقا کے لئے ہر جمہوری ادارے اور کلیدی شعبے میں اپنے جیسے آمر مسلّط کر دیئے تھے جن کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا کہ جمہور کی آواز کا گلا گھونٹ دیا جائے طلبا کو اس دور میں خاص طور پر مشقِ ستم بنایا گیا، درسگاہوں کا تقدّس پامال کیا گیا اور یونیورسٹی آرڈیننس جیسے کالے قوانین کے ذریعہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کو جیل خانوں میں تبدیل کر دیا گیا۔

ایوب خاں اپنی سازشی تدابیر کے باوجود عوامی غیض و غضب سے محفوظ نہ رہ سکے، مگر کراچی یونیورسٹی کے چھوٹے ایوب خاں عوامی احتساب سے محفوظ اب تک جمہور کُش کارروائیوں میں مصروف ہیں۔ کراچی یونیورسٹی آج بھی سازشوں کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ وائس چانسلر کے جی حضوری اساتذہ اور طلبا ہر طرح کی سہولتوں سے بہرہ مند ہیں۔ وہ وظائف پر بیرونی ممالک کو بھیجے جاتے ہیں، ترقی کے دروازے اُن پر کھلے رہتے ہیں۔ شعبہ جاتی مراعات اور دیگر سہولتوں میں اُنہیں فوقیت دی جاتی ہے، اس کے برعکس آزاد خیال، جمہوریت پسند اور لائق اساتذہ اپنے اصولوں کی وجہ سے ہمیشہ وائس چانسلر کے معتوب اور انتقامی کارروائیوں کا نشانہ بنے رہتے ہیں۔ مسز شائستہ زیدی، مسٹر زیدی، مسٹر افتخار امام، مسٹر احمد علی، مسٹر نیّر، مسٹر وقار، ڈاکٹر عتیق اللہ، اور ڈاکٹر اطہر رشید وائس چانسلر کے استبداد کا بذاتِ خود نشانہ بن چکے ہیں۔ انہیں اپنے اصولوں کی وجہ سے یونیورسٹی کو خیرباد کہنا پڑا۔ کچھ اساتذہ کی مُدّتِ ملازمت میں توسیع نہیں کی گئی اور کچھ کو ابھی تک دفتری کارروائی کی آڑ میں ہراساں کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔

یونیورسٹی کے ایک لیکچرار نے بتایا کہ وہ دس سال پہلے جامعہ میں پڑھتی تھیں، دس سال کے بعد وہ اسی یونیورسٹی میں پڑھانے لگیں۔ مگر جب کے اداب کے ماحول میں زمین اور آسمان کا فرق پیدا ہو گیا ہے۔ یونیورسٹی کی آزادی مطلق ختم ہو چکی ہے۔ محض سیاسی نظریات کی بنا پر ترقی پسند طلبا کو داخلے نہیں دیئے جاتے اور ایک مخصوص غرض و غایت رکھنے والی اسلام پسند سیاسی جماعت اسلامی جمعیتِ طلبا کی ہر طرح سے حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

خاتون لیکچرار نے بتایا کہ شعبۂ تادیب موجودہ وائس چانسلر کے آمرانہ ذہن کی پیداوار ہے۔ جس کا مقصد یونیورسٹی میں غیر اخلاقی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی اور صحت مند سرگرمیوں کی حوصلہ شکنی ہے۔ شعبۂ تادیب، یونیورسٹی میں اخلاقی پابندی نہ کرنے والوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرتا، البتہ وہ ترقی پسند سیاسی نظریات رکھنے والے طلبا کے خلاف انتقامی کارروائی فوری کرتا ہے، ترقی پسند اساتذہ اور طلبا کے خلاف معلومات جمع کی جاتی ہیں۔ اور پھر وائس چانسلر کے ایما پر ان کے خلاف سازشوں کا جال پھیلایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں یونیورسٹی میں ایک طرف اسلام کے مقدس نام کو نجی مفادات کے لئے استعمال کرنے کی روایت پڑ چکی ہے، وہیں دوسری طرف امریکی فیشن کو پھلنے پھولنے کے سازگار مواقع ملے ہیں۔ موجودہ وائس چانسلر صاحب اپنے آپ کو اسلام کے بہت بڑے چیمپئن خیال کرتے ہیں، اور یونیورسٹی سے "منفی خیالات" ختم کرنے کی فکر اُن پر ہر گھڑی سوار رہتی ہے۔ لیکن موصوف نے اس جانب کبھی توجہ نہیں کی کہ یونیورسٹی امریکی فیشن کے سیلاب میں کہاں پہنچ گئی۔

کراچی یونیورسٹی کا شمار پاکستان کی بڑی یونیورسٹیوں میں ہوتا ہے۔ اور یونیورسٹی اصولی طور پر اعلیٰ علمی و ادبی سرگرمیوں کا سب سے بڑا مرکز ہوتی ہے۔ اس قسم کی سرگرمیوں سے ذہن کو وسعت اور کشادگی ملتی ہے اور زندگی کے پیچیدہ مسائل کی گرہیں کھلتی ہیں۔ لیکن یونیورسٹی میں اس قسم کا آزاد ماحول کبھی میسّر نہیں آیا۔ یہ دانش گاہ ایسی صحت مند ادبی محفلوں سے یکسر محروم رہی ہے۔ یہاں ایسے شاعر، ادیب یا دانشور نہیں



وائس چانسلر کی "اسلام پسندی" اتنی شدید ہے کہ جمعیتِ طلباء انہیں مولانا مودودی کی جگہ جماعت اسلامی کا امیر بنانا چاہتی ہے۔ روزنامہ "ڈیلی نیوز" کے کارٹونسٹ نے اس اطلاع کو کارٹون کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔

طلباء کے اداروں پر وائس چانسلر نے خود قبضہ کر لیا

بلائے جاتے جو زندگی، آرٹ، اور کلچر پر گہری بصیرت رکھتے ہوں، اگر مدعو کیا جاتا ہے تو شورش کاشمیری اور الطاف حسن قریشی جیسے لوگوں کو جو یہاں آکر بھٹو، بھاشانی اور دوسرے ترقی پسند قائدین کا نام لے کر انہیں بُرا بھلا کہتے ہیں اور جماعت اسلامی کے نظریات کا علانیہ پروپیگنڈہ کرتے ہیں۔

موجودہ وائس چانسلر سے پہلے یونین اور سوسائٹیوں کا سارا انتظام طلباء کے ہاتھوں میں ہوتا تھا، یونین اور سوسائٹیاں اپنے دائرہ اختیار میں آزاد تصوّر کی جاتی تھیں اور وہ طلباء کے منظور شدہ دستور کے مطابق کام کرتی تھیں مگر اب یونین پر وائس چانسلر کے "ایک خاص آدمی" کا قبضہ ہے ان کی ہدایت اور مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا۔ اسی طرح سوسائٹیوں پر شعبے کے صدور کا قبضہ ہوتا ہے، حد تو یہ ہے کہ طلباء اپنی تقاریر اور سپاسنامہ صدر سے منظور کراتے ہیں۔ یونین اور سوسائٹی کی تقریبات کی رسمِ افتتاح عام طور پر وائس چانسلر ہی کرتے ہیں، مہمانِ خصوصی کی خدمت میں سپاسنامہ اور ان کے گلے میں ہار ڈالنے کی روایت بھی موجودہ وائس چانسلر کی ڈالی ہوئی ہے، سپاسنامہ پیش کئے جانے کے بعد وائس چانسلر رٹے رٹائے چند کلمات کہتے ہیں جس میں شعبے کی تکالیف دور کرنے کا وعدہ ہوتا ہے۔

یونیورسٹی کے ایک دوسرے استاد نے انکشاف کیا کہ وائس چانسلر یونیورسٹی میں کسی ایسے استاد کا وجود برداشت نہیں کرتے جو ان کی کاسہ لیسی سے دامن بچاتا ہو، اور اپنی الگ رائے رکھتا ہو چنانچہ موجودہ وائس چانسلر کے دورِ اقتدار میں بے شمار لائق اساتذہ کو ان کی انتقامی کارروائیوں کا نشانہ بننا پڑا۔ ۱۹۶۷ء میں تقریباً ۵۵ لیکچراروں کو برطرف کیا گیا تھا، ان کی ملازمت ایڈہاک بنیاد پر تھی، برطرف کئے جانے والے اسسٹنٹ لیکچراروں میں مسٹر افتخار امام، مسٹر وقار، مسٹر احمد علی اور مسٹر نیر بھی شامل تھے۔ مسٹر وقار سوسائٹی کے سیکریٹری تھے۔ اسی زمانے میں ایک قرارداد منظور کی گئی تھی جس میں بعض کوتاہیوں پر انتظامیہ کی مذمّت کی گئی تھی۔ اس بات پر وائس چانسلر سخت چراغ پا ہوئے اور انہوں نے انتقاماً ۵۵ لیکچراروں کو ملازمت سے برطرف کر دیا۔ ان میں سے تقریباً ۵۲ لیکچرار بعد میں خوشامد درآمد کر کے واپس آئے مگر احمد علی، اور نیر صاحب کو دوبارہ بحال نہ کیا گیا۔ انہوں نے وائس چانسلر کے سامنے گھٹنے ٹیکنے سے انکار کر دیا تھا۔ افتخار امام کو اپنی نجی کوششوں سے لیڈز یونیورسٹی میں وظیفہ مل گیا۔ انہوں نے یونیورسٹی میں چھٹی کی درخواست دی، مگر اُن کی چھٹی منظور نہ کی گئی اور ان سے کہا گیا کہ وہ "استعفیٰ دے دیں۔" مسٹر افتخار امام کو مجبوراً استعفیٰ پیش کرنا پڑا۔

شعبہ ریاضی کے صدر وائس چانسلر کے خاص آدمی ہیں۔ انہیں ہر طرح سے نوازا جاتا ہے۔ اس وقت موصوف کی تنخواہ تقریباً دو ہزار ہے جو اُن سے کہیں سینئر ڈاکٹر محمود حسین اور ڈاکٹر افضال قادری کے برابر ہے۔ انہیں ایک ہزار تنخواہ پر رکھا گیا تھا، اور صرف ایک سال کی مدّت میں اُن کی تنخواہ ایک ہزار سے بڑھا کر دو ہزار کر دی گئی۔ ریاضی کی لیکچرار محترمہ شائستہ زیدی کو ملازمت سے برطرف کرانے میں انہیں کا ہاتھ ہے۔ محترمہ شائستہ زیدی کی مستقلی میں جب ایک ہفتہ باقی رہ گیا تھا تو ان کے خلاف کارروائی کی گئی اور انہیں مستقل کرنے کے بجائے ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا۔ ۱۹۶۹ء میں جب ایّوب آمریت کے خلاف عوام کی نفرت اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی تو محترمہ شائستہ زیدی نے شعبہ کے صدر اور وائس چانسلر کے خلاف تحریک چلانے اور بھوک ہڑتال کرنے کی دھمکی دے دی تھی۔ وائس چانسلر اور شعبہ ریاضی کے صدر محترمہ شائستہ زیدی کے اس واشگاف اعلانِ جہاد سے گھبرا گئے اور مجبوراً انہیں ملازمت پر رکھنا پڑا۔

انتقامی کارروائی کی مثالیں

ڈاکٹر عتیق اللہ شعبہ شماریات کے پروفیسر ہیں۔ وہ تین سال سے لیکچرر کے مکان میں رہتے ہیں۔ اُن کے لئے جب مکان بنایا گیا تو وہ شعبہ ریاضی کے صدر کی بیگم صاحبہ کو پسند آ گیا چنانچہ وہ مکان ڈاکٹر عتیق اللہ کو دینے کے بجائے وائس چانسلر کے منظورِ نظر یعنی شعبہ ریاضی کے صدر کو دے دیا گیا، موصوف کے پہلے مکان کا نمبر B. ۱۵ تھا اور اب وہ جس مکان میں رہتے ہیں اس کا نمبر ۱۳ - A ہے۔

۱۹۶۸ء کا واقعہ ہے، مسلم فلاسفی کا ایک پرچہ مسٹر ایم ایم احمد کو بنانے کے لئے دیا گیا۔ اُن کا تعلق یونیورسٹی سے نہ تھا۔ یونیورسٹی میں وہ پرچہ ڈاکٹر منظور پڑھاتے تھے۔ یونیورسٹی



ملازم بچوں نے کیا کہا؟

- ہمیں شوق سے پڑھنے کا موقع ہی نہیں ملا
- گندی نالیوں میں اپنا رزق تلاش کرنا پڑا
- ہمیں اٹھارہ گھنٹے کی مشقت ملی
- اپنے مالکوں کے نازیبا سلوک سے ہمیں دکھ ہوتا ہے

ہمارے ساتھیوں کو اس اذیت سے بچاؤ ۔ دسویں جماعت کے بچوں کی اپیل

بارہ سال تک کی عمر کے ملازم بچوں کے حالات جاننے کے لئے، پشاور کے ایک سکول میں دسویں جماعت کے طلبا نے سروے کیا۔ اس کی رپورٹ یہ طلبا ہی پیش کر رہے ہیں

طلباء اور ان کے مسائل کے متعلق تو بہت کچھ کہا جا رہا ہے۔ لیکن ان جیسا ایک ایسا طبقہ بھی ہے جسے کبھی قابلِ توجہ نہیں سمجھا گیا ہے۔ ہماری مراد تعلیم سے محروم اُن بچوں سے ہے، جنہیں نہ پیٹ بھر کھانا نصیب ہوتا ہے اور نہ ہی تن ڈھانپنے کو کپڑا، ستم بالائے ستم کہ وہ اپنے مسائل بھی طلباء کی طرح پیش کرنے کے قابل نہیں۔

سروے کے ذریعے ہم نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ کن وجوہ کی بناء پر ہمارے ساتھی ملازمت کرنے پر مجبور ہوئے؟ وہ کس حال میں ہیں؟ اور ان کا مستقبل کیا ہوگا؟ ہم نے ان باتوں پر خاص طور پر توجہ دی:

الف :۔ ملازم بچے کی تعلیم، عمر اور ظاہری حالت

ب :۔ ملازمت کی نوعیت ۔ تنخواہ ۔ اوقاتِ کار ۔ چھٹیاں ۔ عرصہ ملازمت ۔ مالک کا رویہ ۔ گذشتہ ملازمت ۔ ملازمت چھوڑنے کی وجوہ ۔ اور ملازمت کرنے کی وجوہ ۔

ج :۔ گھر کے افراد کی کل تعداد ۔ کنبہ کی کل آمدنی ۔ والد کا پیشہ ۔ رہائش ۔ خوراک ۔ تفریح کے اوقات اور تنخواہ کا استعمال ۔

د :۔ تعلیم حاصل نہ کرنے کی وجوہات ۔ تلخ یادیں

ذ :۔ مستقبل کا ارادہ

س :۔ والدین اور مالکان کے بچے کے متعلق رائے ۔

اس سلسلے میں کل ۴۷ بچوں کا سروے کیا گیا۔ جن میں مستریوں کے ملازم، ہوٹلوں اور دکانداروں کے ملازم ۔ مسجدوں کے خادم، گھریلو ملازم اور وہ بچے بھی شامل ہیں جو کسی کے پاس ملازم تو نہیں لیکن اپنا پیٹ پالنے کے لئے مزدوری یا کوئی معمولی کاروبار کرتے ہیں سروے سے جو معلومات حاصل ہوئی ہیں، وہ یہ ہیں:

تعلیم، عمر اور ظاہری حالت

۴۷ بچوں میں سے ۲۵ بچوں نے تعلیم شروع کی ۔ لیکن نامساعد حالات کی وجہ سے وہ اسے جاری نہ رکھ سکے ۔ ۶ بچے ایسے ملے جو ملازمت کے ساتھ تعلیم بھی حاصل کر رہے ہیں یعنی کل تعداد کا ۴۲ فیصد بچوں نے تعلیم شروع کی اور ۹ فیصد اُسے جاری رکھ سکے تعلیم جاری نہ رکھنے کی وجہ غربت بتائی گئی، لیکن بعض بچوں نے تعلیم سے شوق نہ ہونے کا اقرار کیا۔ لیکن دوسرے سوالات پوچھے گئے تو، معلوم ہوا کہ غربت نے انہیں شوق سے تعلیم حاصل کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

بارہ سال کی عمر تک کے بچوں کا سروے کیا گیا۔ ان ملازم بچوں میں چھ سال کی عمر کے بچے بھی شامل ہیں ۔

مستریوں اور معمولی درجے کے ہوٹلوں میں کام کرنے والے بچوں کے کپڑے انتہائی غلیظ اور بدبودار پائے گئے جبکہ دکانداروں، گھریلو ملازموں اور مسجد میں کام کرنے والے بچوں کے کپڑے پھٹے ہوئے لیکن صاف تھے۔ مستریوں اور معمولی درجے کے ہوٹلوں کے ملازم بچے ۱۲ سے ۱۴ گھنٹے تک یہ غلیظ کپڑے پہنے رکھتے ہیں ۔ جن سے ان کی صحت پر بُرا اثر پڑتا ہے۔

صحت

تقریباً ۸۰ فیصد بچوں کی صحت خراب، جسم دُبلا پتلا اور چہرے پر پژمردگی نمایاں تھی۔ سوائے چند مالکوں کے باقی تمام اپنے ملازم بچوں کی صحت کا کوئی خیال نہیں رکھتے۔ ایک بچے نے بتایا کہ اُسے گذشتہ چھ دنوں سے بخار ہے۔ لیکن اس کی دوا کا کوئی بندوبست نہیں وہ سارا دن بخار میں جھلستا رہتا ہے۔ دوا تو درکنار کوئی اس کا حال تک نہیں پوچھتا۔ غلیظ ماحول میں رہنے والے بچے مختلف بیماریوں میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں۔ کھانسی اور بخار کی شکایت اکثر بچوں نے کی۔ کئی بچوں کے کام کی نوعیت ایسی ہے جو صحت کے لئے از حد مضر ہے، مثلاً منڈیوں میں تمباکو صاف کرنے پر بچوں کو مامور دیکھا۔ ہمارے لئے یہاں چند منٹ ٹھہرنا دوبھر ہو گیا تھا جبکہ یہ بچے سارا دن ایسی ہی گندی فضا میں گذارتے ہیں۔

کام کی نوعیت

ہوٹل کے ملازم بچوں سے برتن دھونے یا ٹیبل بوائے کا کام لیا جاتا ہے۔ ذرا اچھے ہوٹلوں میں یہ استقبالیہ کے

فرائض انجام دیتے ہیں۔ گھریلو ملازموں سے سودا سلف اور گھر کی صفائی وغیرہ۔ مسجدوں میں بچوں سے تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ مسجد کی صفائی، اساتذہ کی خدمت اور محلے سے دو وقت گھر گھر جاکر اپنے اور اپنے اساتذہ کے لئے روٹی کی بھیک مانگنی پڑتی ہے۔ دکانداروں کے پاس ملازم بچے اپنے مالکوں کے کام میں ہاتھ بٹاتے ہیں۔ مستریوں کے پاس ملازم بچے پرزوں کی صفائی اور اکثر مزدوروں جیسا کام کرتے ہیں یا چھوٹے موٹے کاموں میں مالک کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ کئی بچے خوانچے لگاکر اور کئی جوتوں پر پالش کرکے اپنے خاندان کی کفالت کرتے ہیں اور کتنے ہی بچے گلی گلی پھر کر گندی نالیوں سے اور گندگی کے ڈھیروں سے ہڈیاں اور شیشے کے ٹکڑے جمع کرکے فروخت کرتے ہیں اور اپنا پیٹ پالتے ہیں۔

تنخواہ

تنخواہ کے سلسلے میں بڑی عجیب باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ مستریوں کے ملازمین کا کچھ حصہ کام سیکھنے کی توقع میں مفت کام کرنے پر مجبور ہے۔ البتہ جنہیں تنخواہ ملتی ہے وہ بھی ایک روپے سے آٹھ روپے ماہوار تک ہے۔ ہوٹلوں میں کام کرنے والوں کی اوسط تنخواہ ۳۰ روپے ماہوار، گھریلو ملازموں کی ۱۵ روپے ماہوار اور دکانداروں کے پاس ملازم بچوں کو ۲۰ روپے ماہوار تنخواہ ملتی ہے۔ ۴۷ بچوں میں سے ۵ بچوں کو تنخواہ نہیں ملتی اور باقی بچوں کی اوسط آمدنی ۲۵۶۵ روپے بنتی ہے۔ ۱۳ بچوں کی تنخواہ ۴۰ روپے سے ۷۵ روپے تک اور ایک بچے کی تنخواہ ۱۲۰/- روپے ہے۔

اوقاتِ کار: مستریوں کے ملازم ۱۲ سے ۱۴ گھنٹے، ہوٹل کے ملازمین ۸ گھنٹے، مسجد کے خادم ۶ گھنٹے، گھروں میں ملازم ۱۸ گھنٹے اور دکانداروں کے ملازم بچے تقریباً ۱۱ گھنٹے روزانہ کام کرتے ہیں جبکہ نانبائیوں کے پاس ملازم بچے صبح دوپہر اور شام مجموعی طور پر ۱۲ گھنٹے روزانہ کام کرتے ہیں۔ اوقاتِ کار کے متعلق یہ حقائق پر مبنی معلومات قوانین کی بے بسی پر ماتم کناں ہیں جہاں ہم نے پندرہ بچوں سے سروے کے لئے معلومات حاصل کیں وہاں سینکڑوں ہی بچے کام کرتے ہیں اور اسی جگہ پر ایک بہت بڑا لیبر ڈیپارٹمنٹ قائم ہے۔

چھٹیاں: سروے کئے گئے بچوں میں سے ۳۲ کو ماہ بھر میں کوئی چھٹی نہیں ملتی ہے ۳۷ بچوں کو ہفتے میں ایک، ۳ بچوں کو پندرہ دنوں میں ایک اور ۲ بچوں کو ہفتے میں دو چھٹیاں ملتی ہیں یعنی ۵۰ فیصد بچوں کو ہفتے میں ایک، تین فیصد کو ہفتے میں دو، چار فیصد کو پندرہ دنوں میں ایک چھٹی ملتی ہے جبکہ ۳۴ فیصد تعطیلات سے قطعاً محروم ہیں۔

ہماری دن رات کی محنت کے باوجود گھر کا خرچ پ

عرصۂ ملازمت: بعض بچوں کو کام شروع کئے ہوئے چند ماہ ہوئے ہیں لیکن نصف سے زیادہ تعداد ایسی ہے جنہیں ایک سے چھ سال تک ملازم ہوئے ہو چکے ہیں سوائے چند بچوں کے باقی تمام اپنی ملازمت کے باوجود تنخواہ میں کوئی اضافہ یا کوئی ترقی نہ پا سکے۔

مالک کا رویہ

اس سوال کے جواب میں اکثر بچوں نے مالک کے رویہ کو اچھا بتایا لیکن دوسرے سوالوں کے جوابات میں انہوں نے سخت رویئے، گالیوں اور مار پیٹ کا دبی زبان میں اظہار کیا۔ چند بچوں نے واضح طور پر مالک کے رویئے کو خراب بتایا۔ ہمیں معلوم ہوا کہ بچوں کو معمولی غلطیوں پر لعن طعن اور مار پیٹ کی جاتی ہے۔ ذرا تاخیر سے آنے پر اُس دن کام پر نہیں لیا جاتا۔ اکثر مالکان ملازموں سے غلاموں کا سا سلوک کرتے ہیں۔

پہلی ملازمت اور چھوڑنے کی وجوہ: ۴۷ بچوں میں سے ۱۶ بچے موجودہ ملازمت سے پہلے دوسری جگہوں پر ملازمت کر چکے ہیں۔ ان ۱۶ بچوں میں سے ۲ بچے اپنے کسی عزیز کی وفات پر ملازمت چھوڑنے پر مجبور ہوئے جبکہ باقی ۱۴ بچوں نے اپنے مالکوں کے نازیبا رویے سے تنگ آکر پہلی ملازمت کو خیرباد کہا۔ اس سلسلے میں ایک بچے نے بتایا کہ وہ ویلڈنگ کرنے والے ایک مستری کے پاس ملازم تھا۔ مستری خود تو سیاہ شیشے استعمال کرکے اپنی آنکھوں کو بچا لیتا تھا لیکن مجھے اس کے ساتھ بغیر شیشے کام کرنا پڑتا تھا۔ نتیجے کے طور پر میری نظر کچھ خراب ہوگئی اور اس نے مجھے ملازمت سے نکال دیا۔ ایک دوسرے بچے نے بتایا کہ وہ اپنے ایک چچا کی معرفت ایک آدمی کے پاس نوکر ہوگیا تھا۔ چچا کی وفات پر چونکہ اس کی پشت پناہی کرنے والا کوئی نہ تھا لہٰذا اُسے ملازمت سے جواب مل گیا۔

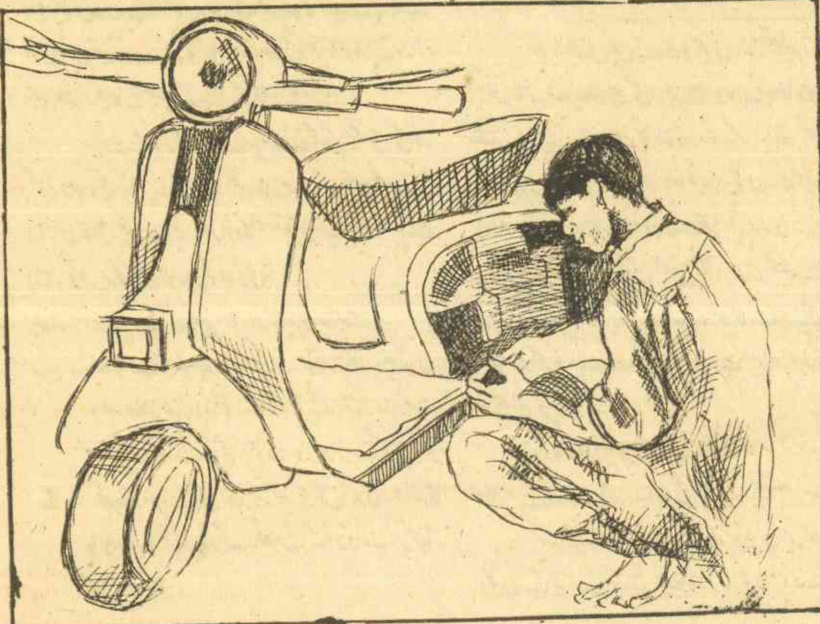
ملازمت کرنے کی وجوہ: جن بچوں کا سروے کیا گیا، ان میں سے ۴ فیصد بچوں کو اس کام کے سیکھنے کا شوق ہے۔ ۲ فیصد بچوں نے ملازمت اس لئے اختیار کی ہے کہ وہ اپنے والدین کے کہنے پر کچھ سال تجربہ حاصل کرکے خود کاروبار کرنا چاہتے ہیں جبکہ باقی ۹۴ فیصد بچے صرف غربت سے مجبور ہوکر اپنا اور اپنے گھر والوں کا پیٹ پالنے کے لئے ملازمت کرتے ہیں۔

سروے کے مطابق ۱۰ فیصد بچوں کے والدین انتقال کر چکے ہیں۔ ۸ فیصد بچوں کی مائیں تو زندہ ہیں لیکن باپ کا سایہ سروں سے اٹھ چکا ہے۔

۴۷ بچوں میں سے ۱۷ بچوں کے والد زندہ نہیں جبکہ باقی بچوں میں سے ۹ بچوں کے والد بیمار ہیں اور کوئی کام کرنے کے قابل نہیں۔ باقی بچوں کے والد مختلف قسم کے معمولی پیشے اختیار کئے ہوئے ہیں۔ ان میں سے اکثر ملازم، مزدور یا کاشتکار ہیں۔

افرادِ خانہ اور آمدن

۴۷ بچوں سے حاصل ہونے والے اعداد و شمار



...رنہ ہو تو سخت ذہنی تکلیف ہوتی ہے

کے مطابق انکے گھروں میں کل ۱۵۰۰ افراد ہیں جن کی مجموعی آمدن ۵۳۲۹۹ روپے ماہوار ہے (اس میں بچوں کی تنخواہ شامل نہیں) یعنی ۴۷ء۱۰ روپے ماہوار فی کس اُن کی آمدن ہے جس میں انہیں تمام خرچ پورا کرنا پڑتا ہے۔ بچوں کی تنخواہ کو اس میں شامل کر کے فی کس ماہوار آمدن ۴۰ء۱۹ روپے ماہوار بن جاتی ہے۔ یعنی ان نوخیز بچوں کی محنت اور مستقبل کی تباہی کے بعد ان غریب کنبوں کی آمدن میں سے صرف ۹۳ پیسے فی کس ماہوار کا اضافہ ہوتا ہے۔

اس سوال کے جواب میں کہ گھر والوں کا رویّہ اُنکے ساتھ کیسا ہے ۱۸ فیصد بچوں نے اسے خراب و باقی نے اچھا بتایا۔

رہائش: - ۷۴ بچوں میں سے ۶۲ بچے دن بھر کام کرنے کے بعد رات کو اپنے گھر چلے جاتے ہیں جبکہ ۱۲ بچے اپنے مقامِ ملازمت پر رات بسر کرتے ہیں۔ ان میں مسجد کے خادم بچے، گھریلو ملازم اور ہوٹل کے ملازمین شامل ہیں۔ ہوٹلوں میں کام کرنے والے بچوں نے بتایا کہ وہ رات کو دکان کے تھڑے یا زمین پر سوتے ہیں۔

خوراک

حاصل شدہ معلومات کے مطابق تمام بچے کام کے دوران میں کھانے کے وقت پر مالک کے خرچ پر کھانا کھاتے ہیں۔ مستریوں کے پاس ملازم بچوں میں سے اکثر کو ۵۰ پیسے فی کس دوپہر کے وقت کھانے کے لئے دئیے جاتے ہیں اس کے علاوہ مالک سے بچی ہوئی چائے وغیرہ بھی نہیں مل جاتی ہے البتہ ایسے بچے جو رات اپنے گھروں میں رہتے ہیں صبح کا ناشتہ اور شام کا کھانا اپنے گھر کھاتے ہیں جو بچے رات بھی مقامِ ملازمت پر بسر کرتے ہیں ان کے دونوں وقت کھانے اور ناشتہ کا انتظام مالک کرتا ہے۔ البتہ ہوٹلوں میں ملازم بچوں نے کہا کہ انھیں صرف گاہکوں سے بچے کھچے روٹی کے ٹکڑے اور خراب ترکاری کھانے کو دی جاتی ہے۔ قہوہ خانوں کے ملازمین تقریباً ہر وقت چائے کے ساتھ روٹی کھاتے ہیں اور ترکاری کو ترس جاتے ہیں۔

تفریح: - کل ملازم بچوں کا ۴۳ فیصد حصّہ تفریح سے ناآشنا ہے۔ یعنی انہیں فارغ وقت ہی نہیں ملتا جبکہ باقی بچے اپنے تفریح کے اوقات گلی کوچوں یا باغوں میں کھیل کر گزارتے ہیں۔ کچھ بچے فلم بھی دیکھتے ہیں۔

تنخواہ کا استعمال: - جن بچوں کا سروے کیا گیا۔ ان میں ۷ فیصد بچوں کو کوئی تنخواہ نہیں ملتی۔ ۱۲ فیصد بچے تنخواہ کو جیب خرچ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ۷ فیصد بچے یا تو تنخواہ جمع کرتے ہیں یا اپنے کپڑے بناتے ہیں جبکہ باقی ۶۹ فیصد اپنی تنخواہ گھر والوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔

مستقبل کا ارادہ: - تقریباً ۳۷ فیصد بچوں نے بڑے ہو کر وہی کاروبار کرنے کی خواہش ظاہر کی جو اُن کے مالک کرتے ہیں۔ ۲۲ فیصد بچوں نے بتایا کہ ان کی زندگی وسائل



نہ ہونے کی وجہ سے مزدوری ہی میں بسر ہو گی۔ جبکہ باقی بچے اپنے مستقبل کے ارادے کے متعلق کچھ نہ بتا سکے۔

ملازمت کے ساتھ تعلیم: - صرف ۶ بچے ایسے ملے جو جز وقتی طور پر ملازمت کرتے ہیں اور دن کے وقت مختلف سکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ باقی بچوں میں سے ۷ بچے ملازمت کے ساتھ مذہبی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور باقی سب بچے زیورِ تعلیم سے بالکل محروم ہیں۔

سکول میں داخلہ کیوں نہیں لیا؟ اس سوال کا جواب تقریباً سبھی نے ایک لفظ میں دیا یعنی غربی چند بچوں نے والدین کی ناخواندگی اور کچھ نے تعلیم سے شوق نہ ہونے کا اظہار کیا۔

ملازم بچوں کی خاص مشکلات: - بچوں سے چونکہ معمولی قسم کے کام لیے جاتے ہیں لہذا انہیں اپنے کام کے سلسلے میں کوئی خاص مشکل درپیش نہیں ہوتی البتہ سردیوں اور سخت گرمیوں میں ان کی حالت قابلِ رحم ہوتی ہے۔ ہوٹلوں میں ملازم بچوں نے اپنی خاص مشکل یہ قرار دیا کہ انہیں برتن دھونے پڑتے ہیں اور برتن اکثر ٹوٹ بھی جاتے ہیں اس طرح مالک انکی تنخواہ سے کافی حصّہ ٹوٹے ہوئے برتنوں کی قیمت کے طور پر کاٹ لیتے ہیں۔

کوئی تلخ یاد: - اس سوال پر یا تو بچوں نے کوئی جواب نہ دیا اور یا اپنے کسی عزیز کی وفات کو ایک تلخ یاد قرار دیا۔

ذہنی کوفت: اس سلسلے میں تقریباً تمام بچوں نے دوسری باتوں کے علاوہ مالک کے نازیبا رویّے بدکلامی اور مار پیٹ کا ذکر کیا۔ ہوٹل کے ملازم بچوں نے بعض گاہکوں کے رویّے کی شکایت کی اور بتایا کہ انہیں سخت لہجے میں پکارا جائے تو انہیں کوفت ہوتی ہے۔ ایک بچے نے کہا کہ وہ ملازمت اسلئے کر رہا ہے کہ وہ کچھ کام سیکھے لیکن جب وہ مالک کو کسی کام سکھانے کے لئے کہتا ہے تو وہ اسے جھڑک دیتا ہے۔ مالک کے اس رویّہ سے اسے ذہنی پریشانی ہوتی ہے کہ اُس سے مُفت میں مزدوروں جیسا کام لیتا ہے لیکن کام نہیں سکھاتا۔ کچھ بچوں نے بیمار والدین کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ جب وہ اتنی محنت کے باوجود ان کی بیماری کا علاج نہیں کرا سکتے تو انہیں سخت پریشانی ہوتی ہے۔ کچھ بچوں نے اس سوال کے جواب میں کہا کہ گھر کا خرچ پورا نہ ہونے کی وجہ سے انہیں ذہنی کوفت ہوتی ہے۔

والدین اور مالکان کی بچوں کے متعلق رائے:

اس سوال کا جواب اِن تمام بچوں کے والدین اور مالکوں سے حاصل نہ کیا جا سکا تاہم جن سے ملا جا سکا ان میں سوائے ایک مالک کے جس نے بچے پر کام چوری یا شرارت کا الزام لگایا باقی والدین اور مالکوں نے بچوں کی دیانتداری، محنت، شوق اور فرمانبرداری کا اقرار کیا۔

اِن تمام حقائق کے پیشِ نظر اس بات کا اندازہ مشکل نہیں کہ ہمارے ساتھی کن حالات میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور ان کا مستقبل کیا ہو گا۔

ھم اپنے بزرگوں سے انسانیت کے نام پر اپیل کرتے ہیں کہ وہ ہمارے ساتھیوں کو اس اذیت ناک ملازمتوں سے چھٹکارا دلائیں۔

یہ سروے "یونٹ تنظیم الخدمت گورنمنٹ ہائی سکول نمبر ۳ پشاور" نے کیا۔ اس کی نگرانی کے فرائض جناب محمد رضا ایم اے، بی ایڈ نگران یونٹ نے انجام دیئے۔

سروے کنندگان: (۱) اقبال احمد ناز، یونٹ انچارج (۲) محمد محسن صدیقی جماعت دہم (۳) عقیل احمد حالی جماعت دہم (۴) نصر اللہ جان جماعت دہم (۵) محمد اورنگ زیب جماعت دہم (۶) اقبال احمد نیّر جماعت دہم (۷) محمود بیگ جماعت دہم

یوسف شوورو
ترجمہ: نعیم آروی

فلسطین میرا گھر ہے

رات لُٹتی بکھرتی جا رہی ہے۔ بس کچھ ہی دیر میں روشنی کا سیلاب بہہ نکلنے والا ہے۔ تاریکی کے بادل ہمیشہ کے لئے چھٹ جائیں گے اور درد میں ڈوبے ہوتے جسم کو قرار آجائے گا۔

ابراہیم ہفتے کی شام کے آٹھ بجے فنلے روڈ پر تھا۔ وہ اس علاقے سے بخوبی آگاہ تھا۔ جب وہ پہلی بار ایک یوسنکل طیارے کے ذریعہ لندن میں اترا، اس وقت سے یہ علاقہ اس کی زندگی میں رچ بس گیا تھا۔ پارٹی خاصہ ہنگامہ خیز اور مسرور کُن ثابت ہوئی تھی۔ چند روز قبل کالج ہال میں رونالڈ نے اُسے پارٹی میں مدعو کیا تھا۔ اس نے بڑے ڈرامائی اور پراسرار انداز میں اپنے چہرے کو اپنے دوست کے قریب لاتے ہوئے کہا تھا، "ابراہیم تم پارٹی میں ضرور آؤ، تمہیں ایک حیرت انگیز بات نظر آئے گی۔"

اس کی زندگی عمر کے ستائیس برسوں کے بوجھ میں دب کر رہ گئی تھی اور وہ اس بوجھ میں دبا ہوا اپنی ملول زندگی کی، تنہائی کو مسلسل گھسیٹ رہا تھا۔ یہ سارے سال کس طرح سے گذر گئے۔ اسے احساس تک نہ ہوا۔ کبھی کبھی وہ ملبولا روڈ کے چھوٹے اور تنگ کمرے میں گھنٹوں اپنے آپ کو بند کئے رکھتا، اس کے ذہن میں ماضی کے دریچے کھُل جاتے، وہ جگہیں اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگتیں، جہاں اس نے اپنی آنکھیں کھولی تھیں سب بے شمار جانے پہچانے علاقے، جگہیں اور ان کے نام، آپس میں گڈمڈ ہونے لگتے۔ لیکن جب اسے وطن کا نام یاد آتا تو اس کے ذہن پر تازیانہ سا لگتا، اور اس کا پورا جسم آزردگی کے سمندر میں ڈوب جاتا آج جب وہ یورپ روانہ ہونے والا تھا۔ اسے اپنے ایک منجھے ہوئے دوست کا مشورہ یاد آرہا تھا۔ اس نے کہا تھا، "زندگی ایک پہلوان کی طرح گذارو، اعصاب پر بوجھ ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ الفاظ سے کام نکالنا سیکھو۔"

یہ الفاظ اس کے ذہن میں ہمیشہ جھلملاتے رہے، وہ جب کبھی کسی ایسی محفل میں شریک ہوا جہاں ملک کی آزادی اور تحفظ کے موضوع پر بحث چھڑ گئی ہو تو اس کے ذہن میں مشورہ دینے والے اس دوست کی یاد ضرور تازہ ہو گئی۔ وہ پارٹیوں میں ہمیشہ دیر سے پہنچتا تھا۔ تاکہ پہلی نظر میں، وقت پر پہنچنے والے تمام چہروں کا مطالعہ کر سکے اور اگر ان میں اس قسم کا کوئی شخص موجود ہو تو اس کے ساتھ بحث کے لئے اپنے آپ کو پہلے سے تیار کر لے۔ وہ اپنے پُرجوش اور جنگجویانہ جذبے کو مایوس کئے بغیر فتح کی تلاش کرتا اور شکست سے سیکھنے کی کوشش کرتا۔ لندن کی تنہا زندگی نے اسے اپنے آپ پر اعتماد کرنے کا سبق دیا تھا جذباتی رشتے، فاقہ زدہ انسان کے منہ میں روٹی کے نوالے کی طرح دیکھتے دیکھتے تحلیل ہو جاتے ہیں۔ اس نے نمبر ۴۹ کی جانب دیکھا۔ فلیٹ تیسری منزل پر تھا۔ بغلی سڑکیں سنسان اور خاموش تھیں۔ اس علاقے کے مردہ دل باشندوں نے اپنے آپ کو بند دریچوں کے پیچھے کمروں میں مقید کر لیا تھا ٹیلیویژن کی مدہم روشنی میں وہ خود کو پہروں مصروف رکھنے کے عادی ہو چکے تھے۔

سڑک کی دوسری جانب سے رقص و موسیقی کی ہلکی ہلکی آوازیں اس کے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ لیکن وہ رکا نہیں اور اپنے مخصوص انداز میں چلتا رہا۔ نمبر ۴۹ بڑی نفاست کے ساتھ ہمیشہ کھلے رہنے والے دروازے پر چسپاں ہوا تھا۔ چکر دار سیڑھیاں برہنہ تھیں پہلی منزل میں زندگی کے کوئی آثار نہ تھے۔ قدموں کی دوسری پرواز اُسے بالائی منزل پر لے آئی، جہاں بڑے ہال کی مدہم روشنی چھن چھن کر باہر گر رہی تھی۔ اس نے کمرے کی گھنٹی بجانے کا ارادہ کیا مگر نیم وا دروازے کو دیکھ کر اپنا خیال ترک کر دیا۔ کمرے سے شور و غل کی ملی جلی آوازیں باہر آرہی تھیں۔ دروازہ کھُل گیا اور اندر کا ماحول دیکھ کر اس کی آنکھیں سیاہ بلی کی مانند حیرت اور تعجب سے کھُل گئیں وہ کئی لمحوں تک دروازے پر کھڑا رہا۔ نگاہوں کے سامنے پھیلے ہوئے بے شمار چہرے اس کے لئے اجنبی تھے۔ ان چہروں پر تازگی اور بشاشت تھی، جیسے بیروت کی کسی دکان کے شوکیس میں بے شمار چمکیلے جوتوں کو سجا کر رکھ دیا گیا ہو۔ وہ رقص کر رہے تھے، قہقہے لگا رہے تھے، شراب پی رہے تھے اور ایک دوسرے کا بوسہ لے رہے تھے اس نے اپنے لئے ایک الگ تھلگ گوشہ منتخب کیا جہاں سے وہ ہر شخص کو دیکھ سکتا تھا۔ اچانک اس کے کانوں سے رونالڈ کی مانوس آواز ٹکرائی۔ "ابراہیم، ہم بہت دیر سے تمہارا انتظار کر رہے تھے۔"

رونالڈ اپنے ہاتھ میں وسکی کا گلاس تھامے ہوئے نوجوان مردوں اور عورتوں کے درمیان میں کھڑا تھا۔ اس جگہ چار لڑکیاں اور تین نوجوان تھے، اس نے مجھے دیکھ کر اپنا ہاتھ نہیں ہلایا، یہ بات اس کی عادت بن گئی تھی۔ وہ ہمیشہ روانگی کے وقت اپنے ہاتھ ہلایا کرتا تھا۔ اس درمیان میں وہ لوگوں کے خیالات اور جذبات پڑھ کر یہ سمجھنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ لوگ اس کے دوست ہیں یا دشمن اس کی زندگی درحقیقت ایک مکّہ باز کی زندگی تھی جو صرف الفاظ پر بھروسہ کرتا تھا۔

ایک نوجوان نے اس کے قریب آکر پوچھا، کیا تم عرب ہو؟" اس نے غور سے اس نوجوان کو دیکھا، اس کا چہرہ شلغم کی طرح تھا اور ناک طوطے کی طرح مڑی ہوئی۔ نوجوان کے سوال کرنے کا انداز اسے پسند نہ آیا۔ یہ انداز ایسا ہی تھا جیسے کسی صاف ستھرے کاغذ میں کوئی گندی چیز لپیٹ کر پیش کر دی جائے۔ رونالڈ نے اسے سگریٹ پیش کی، کسی نے آگے بڑھ کر اس کی سگریٹ سُلگا دی۔ سگریٹ کا کش لینے کے بعد اس نے دوبارہ سوال کرنے والے نوجوان کی طرف دیکھا۔ اس کی چوہے جیسی ناک اس کے خیالات کی چغلی کھا رہی تھی ابراہیم نے اپنے آپ کو پوری طرح قابو میں رکھتے ہوئے بڑی نرمی سے جواب دیا۔

"ہاں، میں عرب ہوں، تمہیں کوئی اعتراض ہے؟"

بے شمار متجسس آنکھیں اس کے چہرے پر لگی ہوئی تھیں، ان آنکھوں میں سینکڑوں سوالات تھے، سینکڑوں زاویے تھے، ہر سوال اور ہر زاویے میں محبت کی نرمی اور اجنبیت کی تلخی تھی۔

چین کے خلاف زہر افشانی کے لئے جامعہ کے لیکچرار کو نیویارک بھیجا گیا

کوڈ کے مطابق ایم ایم احمد صاحب کو پرچے کے سوالات کو ہر طرح سے خفیہ رکھنا چاہتے تھے، مگر وائس چانسلر نے وہ پرچہ ڈاکٹر منظور سے خفیہ نہ رکھا۔ یہاں تک کہ جس لفافے میں سوالات بند کئے گئے تھے اس پر پتہ بھی ڈاکٹر منظور نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا فلسفے کے دوسرے اساتذہ ڈاکٹر اطہر رشید اور انیس الرحمٰن نے اُن کی تحریر پہچان لی اور یہ بات انتظامیہ کے نوٹس میں لائی گئی انتظامیہ اور موڈریشن کمیٹی کے مابین زبانی گفتگو میں اس بات کا اعتراف کیا گیا کہ مذکورہ پرچے کو خفیہ رکھنے کے اصول پر عمل نہیں کیا گیا، اس کے باوجود ڈاکٹر منظور کے خلاف ضابطے کی کوئی کارروائی عمل میں نہیں لائی گئی۔ اس کے برعکس ڈاکٹر اطہر رشید کی مدت ملازمت میں توسیع نہیں کی گئی اور فلسفے کے صدر طیب انصاری کو ہٹا کر ڈاکٹر منظور کو صدر بنا دیا گیا۔ اس سراسر بے انصافی کے خلاف سنڈیکیٹ میں اپیل کی گئی مگر کوئی شنوائی نہیں ہوئی، ڈاکٹر منظور وائس چانسلر کے چہیتے ہیں۔ وہ زمانہ طالب علمی میں اسلامی جمعیت طلبار کے کارکن تھے۔

وائس چانسلر اپنے آدمیوں کو جن کا تعلق عام طور پر جماعت اسلامی یا اسلامی جمعیت طلبار سے ہوتا ہے بطور خاص نوازتے ہیں۔ اور انہیں وظیفہ دے کر باہر بھیجتے رہتے ہیں۔

اکتوبر ۱۹۶۰ء میں ڈاکٹر اجمل اور طاہر ملک کو سنٹرل اوورسیز اسکالرشپ دے کر باہر بھیجا گیا۔ دونوں حضرات جماعت اسلامی کے باقاعدہ سرگرم کارکن تھے۔ سلطان چاولہ کو یونین کا صدر بنوایا گیا، بعد میں موصوف کو یونیورسٹی میں اسسٹنٹ لیکچرر رکھ لیا گیا اور پھر انہیں اسکالرشپ بھی دلوایا گیا۔ نواب زادہ شیر علی اور وائس چانسلر کے ایما پر انہیں نیویارک میں نام نہاد یوتھ ریلی میں بھیجا گیا جہاں انہوں نے چین کے خلاف زہر اگلا تھا جاوید اکبر انصاری اسلامی جمعیت طلبار کے باقاعدہ کارکن تھے، انہیں یونیورسٹی میں لیکچرار رکھا گیا اور اس کے بعد وظیفہ دے کر باہر بھیج دیا گیا۔ انوار حسین کاظمی کو بھی پہلے یونین کا صدر بنوایا گیا۔ اور اس کے بعد معاشیات میں وظیفہ دے کر ہارورڈ یونیورسٹی بھیج دیا گیا۔

خویش پروری یا جہل نوازی

ڈاکٹر شمس الضحیٰ علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم ایس سی اور امریکہ سے مائیکرو بیالوجی میں پی ایچ ڈی ہیں۔ وہ داؤد خیل میں ایک فارماسیٹیکل کمپنی میں ملازمت کرتے تھے۔ انہیں بلا کر مائیکرو بیالوجی میں ریڈر بنا دیا گیا۔ اس کے بعد ان کے لئے "فارمیسی" کا ایک نیا شعبہ کھولا گیا اور انہیں اس شعبے کا صدر بنا دیا گیا حالانکہ موصوف کے پاس فارمیسی کی کوئی سند نہیں ہے۔

محمد فصیح الدین علیگڑھ یونیورسٹی سے ریاضی میں سیکنڈ ڈویژن ایم اے ہیں۔ وہ پہلے محکمہ زراعت میں کلاس II افسر تھے۔ وائس چانسلر نے انہیں یونیورسٹی میں ریڈر کا عہدہ دے کر شعبہ شماریات کا صدر بنا دیا۔ اور ان کی تنخواہ ایک ہزار مقرر کر دی گئی۔ ۲ سو روپے ڈیپوٹیشن الاؤنس اور سو روپے مشرقی پاکستان الاؤنس دیا گیا۔ اسی دوران پریذیڈنٹ سیکریٹریٹ نے ان کی خدمات دوبارہ محکمہ زراعت میں درجہ دوم پر منتقل کر دیں۔ یہ گزٹ بھی ہو گیا۔ اس واقعہ کو تقریباً ایک سال ہو چکا ہے۔ مگر یونیورسٹی انہیں اب بھی ۱۳ سو روپے تنخواہ دے رہی ہے۔

مفت تنخواہ وصول کرتے ہیں

جون ۱۹۶۷ء میں طلبار نے محمد فصیح الدین کے خلاف مظاہرہ کیا اور ان سے پڑھنے سے انکار کر دیا۔ ڈاکٹر عتیق اللہ نے مشورہ دیا کہ موصوف کو ان کی پرانی جگہ یعنی محکمہ زراعت میں واپس بھیج دیا جائے مگر اس مشورے پر عمل نہیں کیا گیا۔ البتہ انہیں شماریات سے شعبہ ریاضی میں منتقل کر دیا گیا۔ اس پورے واقعہ میں سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ موصوف جون ۱۹۶۹ء سے دسمبر تک اپنی تنخواہ شعبہ شماریات کے پے رول سے وصول کرتے رہے جبکہ جنوری ۱۹۷۰ء میں ان کا تبادلہ شعبہ ریاضی میں کیا گیا۔ اس دوران انہوں نے کوئی کام نہیں کیا اور ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنے کی تنخواہ وصول کرتے رہے۔

وائس چانسلر نے "اسلام" کو یونیورسٹی میں اپنے اقتدار کا ذریعہ بنا رکھا ہے اور شعبہ تادیب کے ذریعہ پھیلائے ہوئے جال سے پوری یونیورسٹی کے آزاد اور غیر جانبدار ماحول کو مسموم کر رکھا ہے۔ لیکن جب ایوب جیسے آمر کے پاؤں نہ جم سکیں تو وائس چانسلر اپنی مطلق العنانی کو کتنی دیر قائم رکھ سکتے ہیں۔ دیکھتے دیکھتے محلاتی سازشوں کا قصر زمین بوس ہو گا۔ اور انہیں بالآخر عوامی عدالت میں اپنے "کارناموں" کا جواب دہ ہونا پڑے گا۔

سینیٹ پھر ختم کر دی گئی اساتذہ کے ذہنوں پر آرڈیننس کا پہرہ بٹھا دیا گیا

ایوب خاں کے دور سے پہلے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جمہوریت کا جو تھوڑا بہت عنصر موجود تھا ۱۹۶۳ء میں یونیورسٹی آرڈیننس کے ذریعہ اسے ختم کر دیا گیا۔ پہلے کراچی یونیورسٹی میں ۱۰۰ ارکان پر مشتمل ایک سینٹ تھا جو بڑی حد تک جمہوری انداز میں یونیورسٹی کے معاملات کا فیصلہ کرتا تھا۔ ۱۹۵۸ء میں سینٹ ختم کر دیا گیا اور ۱۹۶۳ء میں یونیورسٹی آرڈیننس کے نفاذ کے بعد سنڈیکیٹ بنایا گیا۔ جس کے ارکان وائس چانسلر کی سفارش پر نامزد کئے جاتے ہیں۔ سنڈیکیٹ میں عام طور پر ایسے افراد لئے جاتے ہیں۔ جو وائس چانسلر کے ہوا خواہ ہوتے ہیں۔ یونیورسٹی آرڈیننس اور سنڈیکیٹ کے ذریعہ تعلیمی آزادی کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ اور اساتذہ اور طلبا کے ذہنوں پر پہرہ بٹھا دیا گیا۔

کراچی یونیورسٹی ٹیچرز سوسائٹی گذشتہ ایک سال کی مدت سے یونیورسٹی کے اساتذہ کے خیالات و جذبات کو اپنی قراردادوں اور یادداشتوں کی صورت میں وائس چانسلر کو پیش کرتی رہی، تاکہ اصولوں کی بنیاد پر اساتذہ کے بنیادی مطالبات منظور کر لئے جائیں، مطالبات مارچ ۱۹۷۰ء میں صدارتی کابینہ نے منظور کر لئے تھے۔ اور نئی تعلیمی پالیسی میں بھی شامل کر لئے گئے تھے۔ کراچی یونیورسٹی کے اساتذہ کے بنیادی مطالبات یہ ہیں۔

(الف) یونیورسٹی آرڈیننس ختم کیا جائے۔

(ب) سنڈیکیٹ کو از سر نو مرتب کیا جائے اور اس میں اساتذہ کے منتخب نمائندوں کو نمائندگی دی جائے۔

(ج) یونیورسٹی کے اساتذہ کے لئے تین کیڈرز رکھے جائیں۔ اور

(د) یونیورسٹی پے اسکیل پر نظر ثانی کی جائے۔

۳۰ اور ۳۱ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو آل پاکستان یونیورسٹی ٹیچرز کنونشن منعقدہ کراچی میں ان مطالبات کی توثیق کر دی گئی تھی۔ عوامی رہنماؤں، طلبا، وکلاء، دانشوروں اور ادیبوں نے ۲۵ نومبر ۱۹۷۰ء کو ایک اخباری بیان میں ان مطالبات کی بھرپور حمایت بھی کی تھی۔ لیکن حکومت نے تنخواہوں کے نئے اسکیل میں اساتذہ کے منتخب نمائندوں سے کسی طرح مشورہ لئے بغیر ایک بار پھر بنیادی مطالبات نظر انداز کرنے کی پالیسی کا اعادہ کیا ہے جس سے یونیورسٹی کے اساتذہ میں بے اطمینانی پھیل گئی ہے۔

بائیس خاندانوں کے استحصال کی لرزہ خیز کہانی

سوتی، اونی اور ریشمی کپڑے سیمنٹ کیمیکلز جہاز رانی اور انشورنس ولیکا کی دولت کے ذرائع ہیں

اس ترقی کی ابتدا معمولی دکانداری اور پولیس کی ملازمت سے ہوئی

کریسنٹ خاندان کی طرح ولیکا بھی پاکستان کے پہلے چار بڑے سرمایہ دار خاندانوں، داؤد، سہگل، آدم جی اور حبیب سے کوئی تقابل نہیں رکھتے بہر حال ولیکا خاندان پاکستان کے ۲۲ بڑے سرمایہ دار خاندانوں میں چھٹے نمبر پر ہے۔ وہ کریسنٹ خاندان سے کچھ ہی پیچھے ہے۔ آزادی سے پہلے ولیکا خاندان بمبئی کے نواح میں چھوٹا موٹا کاروبار، دوکانداری اور محکمۂ پولیس میں معمولی ملازمت کرتا تھا۔ آزادی کے بعد اس خاندان نے سرکاری سرپرستی میں غلّہ اور دوسری اشیاء کے کاروبار، حبیب بنک سے قرض کی فیاضانہ سہولت اور ہندوستان سے سوتی کپڑے کی درآمد اور پھر اس کی نفع بخش فروخت کے ذریعہ کثیر سرمایہ اکٹھا کیا۔ ولیکا خاندان نے اس طرح حاصل شدہ سرمایہ کو سب سے پہلے ولیکا ٹیکسٹائل ملز میں لگایا۔ آزادی کے بعد پاکستان میں قائم ہونے والی یہ پہلی خاصی بڑی مل تھی۔

تیسرا، پانچواں پھر چھٹا

۱۹۵۵ء میں آدم جی اور داؤد کے بعد، ولیکا تیسرے بڑے سرمایہ دار تھے۔ ۱۹۶۰ء میں آدم جی، داؤد، سہگل اور حبیب کے بعد ان کا نمبر پانچواں ہوگیا۔ ۱۹۶۵ء میں بھی سہگل، آدم جی، داؤد اور

ولیکا چھٹا بڑا خاندان ہے

کریسنٹ کے بعد ان کا نمبر پانچواں ہی رہا لیکن وہ اس وقت تک حبیب خاندان سے آگے نکل گئے تھے۔ ۱۹۶۹ء میں جیسا کہ قبل ازیں بتایا جاچکا ہے اُن کا نمبر چھٹا تھا۔

ولیکا کی سات کمپنیاں

ولیکا خاندان کی جو سات کمپنیاں کراچی اسٹاک ایکسچینج میں درج ہیں ان کے نام یہ ہیں۔

۱۔ ولیکا ٹیکسٹائل ملز
۲۔ ولیکا وولن
۳۔ ولیکا آرٹ فیبرکس
۴۔ محمدی اسٹیم شپ
۵۔ ولیکا سیمنٹ
۶۔ ولیکا کیمیکلز
۷۔ یونائیٹڈ انشورنس

۱۹۶۶ء میں ولیکا خاندان کی ساتوں کمپنیوں کا مجموعی ادا شدہ سرمایہ ۸ کروڑ روپے لیکن ان کے اثاثوں کی قیمت ۲۴ کروڑ روپے تھی۔ پاکستان کے ۲۲ بڑے خاندانوں میں اگرچہ ولیکا کا چھٹا نمبر ہے لیکن عیّارانہ کاروباری اقدامات میں ان کا کوئی مدِ مقابل نہیں۔ انہوں نے قانونی طریقہ طور پر ٹیکس سے بچنے کو ایک فنِ لطیف بنادیا ہے۔ یونائیٹڈ انشورنس کے سوا باقی تمام کمپنیوں کا نظم ونسق دو مینجنگ ایجنسی فرموں کے توسط سے اسی خاندان کے ہاتھ میں ہے۔ احمد شپنگ ایجنسیز لمیٹڈ محمدی اسٹیم شپ کمپنی لمیٹڈ کے مینجنگ ایجنٹس ہیں۔ باقی پانچ کمپنیوں کا نظم ونسق، ولیکا قمرالدین (سندھ) لمیٹڈ کے ہاتھ میں ہے۔

مشترکہ سرمائے سے قائم ہونے والا ولیکا خاندان کا پہلا ادارہ ولیکا ٹیکسٹائل ملز ہے جو ۱۹۴۷ء میں قائم ہوا اور ۱۹۴۹ء میں اس کا نام کراچی اسٹاک ایکسچینج میں درج ہوا تھا۔ اس کا ادا شدہ سرمایہ ۲۰ لاکھ روپے تھا۔ ۱۹۶۹ء تک گذشتہ ۲۲ سال کے عرصے میں اس میں ۱۱۲۲ فیصد کا اضافہ ہوا۔

پاکستان کے پنج سالہ منصوبوں کے دوران میں اس کے ادا شدہ سرمائے میں حسب ذیل اضافہ ہوا۔

سال	ولیکا خاندان کا ادا شدہ سرمایہ (کروڑوں روپے میں)
۱۹۵۵ء	۳
۱۹۶۰ء	۳
۱۹۶۵ء	۸
۱۹۶۹ء	۹

پاکستان کے بیشتر دوسرے بڑے سرمایہ دار خاندانوں کی طرح ولیکا خاندان کی کمپنیوں کی انتہائی تیز رفتار ترقی بھی نجی شعبہ کی آزادانہ توسیع کے نظریے کے تحت دوسرے پانچ سالہ منصوبے کے دوران میں ہوئی۔ اس مدت میں ولیکا خاندان کو سیمنٹ اور کیمیکلز پلانٹوں کے لئے کثیر سرمائے کے اجرا کی منظوری دی گئی۔ کیمیکلز پلانٹ ولیکا خاندان کے لئے بھاری پتھر ثابت ہوا جس کی وجہ سے ان کی مزید توسیع کی راہ مسدود ہوگئی۔ کیمیکلز کی ترقی کے لئے جو فنی معیار مطلوب ہے، وہ ابھی تک ہمارے ملک میں موجود نہیں۔ اور اپنے وسائل سے کام لینے کے جو طریقے ولیکا اور داؤد وغیرہ استعمال کرتے ہیں وہ ایسے نہیں جن سے ان کا معیار بلند کیا جاسکے۔

کیمیکلز پلانٹ ولیکا خاندان کے لئے بھاری پتھر ثابت ہوا جس کی وجہ سے ان کی مزید توسیع کی راہ مسدود ہوگئی۔ کیمیکلز کی ترقی کے لئے جو فنی معیار مطلوب ہے، وہ ابھی تک ہمارے ملک میں موجود نہیں

سال	ولیکا ٹیکسٹائل	ولیکا وولن	محمدی اسٹیم شپ	ولیکا آرٹ فیبرکس	یونائیٹڈ انشورنس	ولیکا سیمنٹ	ولیکل کیمیکلز	میزان
—								—
۱۹۵۴ء	۷۲ لاکھ	۲۲ لاکھ	۲ کروڑ	۲۵ لاکھ	—	—	—	۳ کروڑ ۱۹ لاکھ
۱۹۵۵ء	۷۲ لاکھ	۲۵ لاکھ	۲ کروڑ	۲۵ لاکھ	—	—	—	۳ کروڑ ۲۲ لاکھ
۱۹۵۶ء	۸۶ لاکھ	۳۱ لاکھ	۲ کروڑ	۲۵ لاکھ	-	-	-	۳ کروڑ ۴۲ لاکھ
۱۹۵۷ء	۸۶ لاکھ	۳۷ لاکھ	۱ کروڑ ۶۰ لاکھ	۲۵ لاکھ	-	-	-	۳ کروڑ ۸ لاکھ
۱۹۵۸ء	۸۶ لاکھ	۳۷ لاکھ	۱ کروڑ ۶۰ لاکھ	۲۵ لاکھ	-	—	—	۳ کروڑ ۸ لاکھ
۱۹۵۹ء	۸۶ لاکھ	۳۷ لاکھ	۱ کروڑ ۶۰ لاکھ	۲۵ لاکھ	-	-	-	۳ کروڑ ۸ لاکھ
۱۹۶۰ء	۸۶ لاکھ	۳۷ لاکھ	۱ کروڑ ۶۰ لاکھ	۲۵ لاکھ	۲۰ لاکھ	-	-	۳ کروڑ ۲۸ لاکھ
۱۹۶۱ء	۱ کروڑ ۸ لاکھ	۷۳ لاکھ	۱ کروڑ ۶۰ لاکھ	۲۵ لاکھ	۲۰ لاکھ	-	-	۳ کروڑ ۸۶ لاکھ
۱۹۶۲ء	۱ کروڑ ۲۹ لاکھ	۸۸ لاکھ	۱ کروڑ ۶۰ لاکھ	۲۵ لاکھ	۲۰ لاکھ	۱ کروڑ ۵ لاکھ	—	۵ کروڑ ۲۷ لاکھ
۱۹۶۳ء	۱ کروڑ ۲۹ لاکھ	۸۸ لاکھ	۱ کروڑ ۶۰ لاکھ	۲۵ لاکھ	۲۰ لاکھ	½۱ کروڑ	۳ کروڑ	۸ کروڑ ۲۷ لاکھ
۱۹۶۴ء	۱ کروڑ ۲۹ لاکھ	۸۸ لاکھ	۱ کروڑ ۶۰ لاکھ	۲۵ لاکھ	۲۰ لاکھ	۲ کروڑ	۲ کروڑ	۹ کروڑ ۲۲ لاکھ
۱۹۶۵ء	۹۰ لاکھ	۵۳ لاکھ	۱ کروڑ ۶۰ لاکھ	۱۰ لاکھ	۲۰ لاکھ	۲ کروڑ	۳ کروڑ	۸ کروڑ ۳۳ لاکھ
۱۹۶۶ء	۹۰ لاکھ	۵۳ لاکھ	۱ کروڑ ۶۰ لاکھ	۱۰ لاکھ	۲۰ لاکھ	۲ کروڑ	۳ کروڑ	۸ کروڑ ۳۳ لاکھ
۱۹۶۷ء	۹۰ لاکھ	۵۳ لاکھ	۱ کروڑ ۶۰ لاکھ	۱۰ لاکھ	۲۰ لاکھ	۲ کروڑ	۳ کروڑ	۸ کروڑ ۳۳ لاکھ
۱۹۶۸ء	۹۹ لاکھ	۵۸ لاکھ	۱ کروڑ ۶۰ لاکھ	۱۱ لاکھ	۲۰ لاکھ	۲ کروڑ	۳ کروڑ	۸ کروڑ ۴۸ لاکھ
۱۹۶۹ء	۹۹ لاکھ	۵۸ لاکھ	۱ کروڑ ۹۲ لاکھ	۱۱ لاکھ	۲۰ لاکھ	۲ کروڑ	۳ کروڑ	۸ کروڑ ۸۰ لاکھ

ولیکا ملز تین چوتھائی کپڑا برآمد کر دیتی ہے

ولیکا خاندان کا کاروبار متنوع اور مختلف نوعیت کا ہے۔ مثلاً سوتی، اونی اور مصنوعی ریشمی پارچہ جات سیمنٹ، کیمیکلز، جہاز رانی اور انشورنس۔

ولیکا ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ، ۱۹۴۷ء میں مشترکہ سرمائے سے قائم کی گئی اور ۱۹۴۹ء میں کراچی اسٹاک ایکسچینج میں درج ہوئی تھی۔ آزادی کے بعد کراچی کے سندھ انڈسٹریل ٹریڈنگ اسٹیٹ میں قائم ہونے والی یہ پہلی مل تھی۔ اپریل ۱۹۴۹ء میں مل میں کپڑا بننا شروع ہو گیا تھا۔ اس وقت اس میں ۲۵۰ کرگھے کام کر رہے تھے۔ ۱۹۵۱ء میں مل کے ویونگ ڈیپارٹمنٹ میں مزید ۱۶۰ کرگھوں کا اضافہ کیا گیا۔ مل کی پیداواری صلاحیت کو بڑھانے کے لئے ۱۹۵۲ء میں اس میں ۶ ہزار تکلوں اور جدید قسم کے ایک پرنٹنگ پلانٹ کا اضافہ کیا گیا۔ بعد میں تکلوں کی تعداد بڑھ کر ۵۷ ہزار اور کرگھوں کی تعداد ۱۲۰۳ ہو گئی۔ اور اس میں رنگائی چھپائی اور فنشنگ کے مکمل پلانٹ نصب کر دیئے گئے۔ پیداواری گنجائش کے مرکزی ایکسائز ٹیکس کے تحت عائد شدہ ٹیکس کی ذمہ داریوں کو کم کرنے کی غرض سے بعد میں کرگھوں کی تعداد ۸۰۵ کر دی گئی۔ یہ مل آج کل دھاگہ برآمد کرنے کے بجائے کپڑے کی برآمد پر اپنی توجہ مبذول کئے ہوئے ہے۔ اس مل کا تیار شدہ تقریباً ¾ کپڑا بیرونی ملکوں کو برآمد کر دیا جاتا ہے۔ یہاں انتظامیہ اور مزدوروں کے تعلقات بھی اچھے نہیں ہیں۔

اونی کپڑے کی پیداوار

ولیکا وولن ملز کمپنی لمیٹڈ ۱۹۴۹ء میں مشترک سرمائے سے قائم کی گئی تھی۔ اس کے قیام کا مقصد اونی اور ورسٹڈ دھاگہ، بنائی کا اون، کمبل، شالیں، اونی کپڑا اور ہوزری وغیرہ بنانا تھا۔ ۱۹۵۰ء میں اسے کراچی اسٹاک ایکسچینج میں درج کیا گیا۔ ۱۹۴۹ء میں مل کی منظور شدہ پیداواری گنجائش حسب ذیل تھی۔

۱۳،۳۵۲ ورسٹڈ تکلے،

دو ہزار اونی تکلے اور ۲۱۶ کرگھے

۱۹۶۱ء میں اس کمپنی نے مظہر بھائی وولن ملز اپنی تحویل میں لے لی۔ اور اس کا نام حیدری وولن ملز رکھا۔ اس مل میں ۲۹۶۰ تکلے اور ۶۳ کرگھے ہیں۔ کمپنی نے ولیکا وولن ملز میں ایک وول ٹاپ ڈائینگ پلانٹ لگایا۔ کمپنی نے وول کومبنگ پلانٹ درآمد کرنے کے لئے پیگ سے ۳۱ لاکھ روپے کا غیر ملکی قرضہ حاصل کیا۔ یہ قرضہ ان قرضوں کے علاوہ تھا جو اس پلانٹ کو جدید تر بنانے اور متوازن کرنے کے لئے ۱۹۶۳ء اور ۱۹۶۶ء میں حاصل کئے گئے تھے

ولیکا آرٹ فیبرکس لمیٹڈ ۲۵ نومبر ۱۹۵۳ء کو مشترک سرمائے سے قائم کی گئی تھی۔ اس کا اصل مقصد مصنوعی چرمی کپڑا اور مصنوعی ریشمی پارچہ جات تیار کرنا تھا۔ یہ ۱۹۵۴ء میں کراچی شیئر مارکٹ میں درج کی گئی لیکن اس کا کاروبار سال کے آخر میں شروع ہوا جب مشینری اور ساز و سامان موصول ہوا اور اسے صحیح طریقے پر نصب کر دیا گیا۔ ۱۹۵۷ء کے دوران میں کمپنی نے آزمائشی طور پر پولی تھیلین شیٹ اور نرم و سخت نلکیاں تیار کیں۔

سیمنٹ اور کیمیکلز

ولیکا سیمنٹ لمیٹڈ منگھوپیر کراچی میں واقع ہے یہ علاقہ عرصہ دراز سے چونے اور مٹی کے ان وسیع ذخائر کے لئے عرصہ دراز سے مشہور ہے جن سے سیمنٹ تیار کی جاتی ہے۔ فیکٹری تک پختہ سڑکیں ہیں اور وہاں تک ریلوے لائن بچھانے کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ یہ کمپنی ۱۹۶۱ء میں مشترکہ سرمائے سے قائم کی گئی تھی اور ۱۹۶۲ء میں کراچی اسٹاک ایکسچینج میں درج کی گئی ۱۹۶۲ء میں یہاں سیمنٹ کی پیداوار شروع ہوئی۔

یہ فیکٹری جدید ترین مشینری سے لیس ہے اور پلانٹ LOPOL پروسس پر مبنی ہے۔ LO-POL پروسس میں نم خام سامان کو خشک کرنے کے لئے مزید بھٹی کی ضرورت نہیں پڑتی۔ فیکٹری میں اس وقت ۵۰۰ ٹن سیمنٹ روزانہ بنانے کی گنجائش ہے لیکن کمپنی اس پیداواری اہلیت کو مناسب وقت میں دگنا کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔

ولیکا کیمیکل انڈسٹریز لمیٹڈ کے قیام کا اصل مقصد مولاسس سے اعلیٰ دباؤ کی پولی تھیلین اور قدرتی گیس سے میتھانل، فارمل ڈی ہائڈ اور یوریا فارمل ڈی ہائڈ تیار کرنا تھا۔ یہاں اعلیٰ دباؤ کی پولی تھیلین ۵ ہزار ٹن سالانہ اور میتھانل ۳ ہزار ٹن سالانہ تیار کرنا مقصود تھا پولی میریزیشن پروسس کے ذریعہ ۵ ہزار ٹن پولی تھیلین تیار کرنے کے لئے تین بڑے پلانٹ یعنی الکوہل پلانٹ اتھیلین پلانٹ اور اعلیٰ دباؤ کا پولی تھیلین پلانٹ درکار ہوں گے۔

پولی تھیلین کی بڑھتی ہوئی مانگ کے پیش نظر حکومت نے موجودہ پولی تھیلین پلانٹ کی گنجائش میں مزید دس ہزار ٹن سالانہ پیداوار کی گنجائش پیدا کرنے کی منظوری دی۔ اس طرح اس کی پیداواری اہلیت ۱۵ ہزار ٹن سالانہ ہو گی۔ مزید دس ہزار ٹن کی گنجائش اتھیلین پر مبنی ہو گی

کھاد بنانے کے لئے حکومت نے ایک پلانٹ کی منظوری دیدی ہے جس کے لئے ضروری زرمبادلہ بھی بینکنگ نے منظور کرلیا ہے۔ اس نے ۱۹۶۸ء سے کام شروع کردیا ہے۔

اس پیچیدہ کیمیکلز پلانٹ کے لئے جس فنی سوجھ بوجھ کی ضرورت ہے وہ موجودہ مالکوں کی انتظامیہ کے بس کی بات نہیں کیونکہ وہ پارچہ جات کی صنعت سے جلد جلد منافع حاصل کرنے کے عادی ہوچکے ہیں ٹیرف کے تحفظ اور دوسری مراعات کے باوجود کمپنی ابھی تک اس کے ابتدائی مسائل پر بھی قابو نہیں پاسکی ہے۔ کراچی اسٹاک ایکسچینج میں ولیکا کیمیکلز کے حصص کی قیمت گری ہوئی ہے۔ اس کے قیام کو سات سال گذر چکے ہیں، لیکن اس کے حصص کی قیمت اصل قیمت کے برابر نہیں آسکی ہے۔

جہازرانی اور انشورنس سے منافع

محمدی اسٹیم شپ کمپنی ۱۹۴۷ء میں مشترک سرمائے سے قائم کی گئی تھی اور ۱۹۴۹ء میں اسے کراچی اسٹاک ایکسچینج میں درج کیا گیا۔ اس کمپنی کے قیام کا مقصد ہر قسم کا شپنگ کاروبار کرنا تھا۔ آزادی کے وقت ایسی کوئی شپنگ کمپنی نہیں تھی جس کے مالک مسلمان ہوں اور جو کراچی اور چاٹگام کے درمیان پاکستان کی ساحلی تجارت کا ذریعہ بنے۔ اس کمپنی کے قیام کا اصل مقصد یہ تھا تیز رفتار جہازرانی کا کاروبار کیا جائے۔ اور پاکستان کے دونوں علاقوں کے درمیان ساحلی تجارت کی جائے۔ ۱۹۶۶ء کے اختتام تک کمپنی کے پاس ۵ جہاز تھے جن کا مجموعی ۸۴۰۸۰ ٹن وزن تھا۔ اور دو جہاز، العابدین، اور ٹلیسہ (سوویت یونین میں) اور العباس کراچی شپ یارڈ میں زیر تعمیر تھے بعد میں دونوں جہاز مکمل ہوکر کمپنی کے تجارتی بیڑے میں شامل ہوگئے۔ کمپنی کے جہاز۔ آر۔ سی۔ ڈی۔ کی سروسوں میں حصہ لے رہے ہیں۔ یہ کمپنی اپنی جہاز رانی کمپنیوں لیٹن۔ کیلیفورنیا یوگوسلاویہ اور نیویارک کے لئے کام کررہی ہے۔

دوسرے بہت سے بڑے کاروباری خاندانوں کی طرح ولیکا خاندان نے بھی بہت پہلے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ ان کی اپنی ایک انشورنس کمپنی ہونی چاہیئے تاکہ ان کے مختلف النوع اداروں کے انشورنس کے اخراجات بچائے جاسکیں اور چھوٹی چھوٹی پالیسی ہولڈروں کی رقوم ان کی تحویل میں آسکیں، لہٰذا یونائیٹڈ انشورنس کمپنی لمیٹڈ ۱۹۵۹ء میں قائم کی گئی اور ۱۹۶۰ء میں اسے کراچی اسٹاک ایکسچینج میں درج کیا گیا۔ اس کے قیام کا مقصد پاکستان میں اور دنیا کے ہر حصہ میں انشورنس کا ہر قسم کا کاروبار کرنا تھا۔ یکم جنوری ۱۹۶۰ء سے جنرل انشورنس کا کاروبار اور ۹ مارچ ۱۹۶۰ء سے زندگی کے بیموں کا کاروبار شروع کیا۔ پاکستان دونوں علاقوں کے سترہ اہم مقامات پر اس کی شاخیں قائم ہیں۔ اس انشورنس کمپنی نے زندگی کے بیموں کے کاروبار میں کوئی خاص ترقی نہیں کی لیکن جنرل انشورنس میں پاکستان کی دیگر انشورنس کمپنیوں کے مقابلے میں اس کا آٹھواں نمبر ہے۔ آدم جی حبیب نیو جوبلی دفینسی (پریمیئر دکریسینٹ) اور سنٹرل (دداؤد) بڑے بڑے سرمایہ داروں کی انشورنس کمپنیاں ولیکا کی یونائیٹڈ انشورنس سے جنرل انشورنس کے کاروبار میں بھی آگے ہیں۔

۱۹۶۶ء میں ولیکا خاندان کی سات کمپنیوں کی ۸۰ ڈائرکٹرشپ میں سے حسب ذیل ۳۵ ولیکا خاندان کے پاس ہیں۔

	ولیکا خاندان کے افراد کے نام	کمپنیوں میں ڈائرکٹرشپ
۱	فخرالدین ولی بھائی	۶
۲	سیف الدین ولی بھائی	۷
۳	نورالدین ولی بھائی	۶
۴	نجم الدین ولی بھائی	۶
۵	قمرالدین ولی بھائی	۱
۶	اصغر علی سیف الدین	۶
۷	قمرالدین فخرالدین	۳
	کل میزان	۳۵

ولیکا خاندان کی مرکزی شخصیت فخرالدین ولی بھائی ہیں بعض ملازمین بھی ولیکا خاندان کی کمپنیوں میں ڈائرکٹر شپ پر فائز ہیں۔ ولیکا کمپنیوں میں جن دوسرے بڑے سرمایہ دار خاندانوں کو نمائندگی دی گئی ہے ان میں حتیٰ سنز، نشاط اور داؤد شامل ہیں۔ بڑے سرمایہ دار خاندانوں میں آدم جی واحد خاندان ہے جس کی کمپنیوں میں ولیکا خاندان کو نمائندگی دی گئی۔

ولیکا خاندان کا اپنے حصہ داروں کے ساتھ معاملت میں بھی ویسا ہی خراب ریکارڈ ہے۔ جیسا اپنے صارفین اور ملازمین کے ساتھ ہے۔ ان کی کمپنیوں نے جو منافع تقسیم کیا اس کا اوسط ۱۹۵۶ء میں ۱۹ فی صد اور ۱۹۵۸ء میں ۱۱ فیصد تھا جبکہ لیکن ۱۹۵۴ء سے ۱۹۶۸ء تک ۱۳ سال کے عرصے میں انہوں نے اوسطاً دس فی صد نقد سے زیادہ منافع تقسیم نہیں کیا۔ حقیقت میں چھ سال کے عرصے میں ان کا نقد اوسط منافع ۵ فی صد یا اس سے کم رہا۔ ۱۹۵۴ء میں تین فی صد ۱۹۵۵ء میں چار فی صد ۱۹۶۰ء میں چار فی صد ۱۹۶۱ء میں ۵ فی صد، ۱۹۶۳ء میں ایک فیصد اور ۱۹۶۴ء میں ۲ فی صد

راتوں رات دولت مند بن گئے

قیامِ پاکستان کے بعد آج تک

بددیانتی، رشوت خوری، سفارش، اقربا پروری حتیٰ کہ دن دہاڑے چوری اور سینہ زوری کی ایسی ایسی المناک مثالیں سامنے آئی ہیں کہ معاشرے میں دیانت اور صداقت کی قدروں پر بڑے بڑوں کا اعتماد متزلزل ہوگیا ہے۔ ادنیٰ ملازم کو مستقبل کا تحفظ حاصل نہیں اس لئے وہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹ لینا چاہتا ہے۔ کھاتا پیتا آدمی راحت اور فراغت کے زیادہ اسباب چاہتا ہے۔ اس لئے رات کی رات لکھ پتی بننے کی ہوس اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی، دولتمند آدمی کو تمام وسائل دولت کی اجارہ داری کا خواب ستاتا ہے۔ غرضیکہ زیادہ سے زیادہ دولت اور اختیارات سمیٹنے کی مجنونانہ خواہش ایک ایک کے درپے ہے۔ اور اس دوڑ میں ہر وہ فرد جو تھوڑا سا بھی اثر و اختیار پاس رکھتا ہے، ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کے لئے بیتاب ہے۔ چونکہ سرکاری عہدیدار، اعلیٰ حکام اور وزراء اثر و اختیار کے باب میں بالعموم تمام سیاہ و سپید کے مالک ہوتے ہیں۔ اس لئے انہیں داد و دہش اور عوض معاوضہ کے وسیع مواقع حاصل ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے متعدد وزراء جو آج بھی مرکز اور صوبوں کی وزارت میں بڑے طمطراق سے براجمان ہیں، چند ہی برس پہلے پروڈا ایکٹ کے تحت سزایاب ہوئے تھے۔ ان میں سے اکثر بلاشبہ اپنی موروثی جائداد رکھتے ہیں۔ لیکن ان کی بے پناہ دولت کے متعلق وہ افسانے جو زبان زد عوام ہیں۔ اگر تحقیق کی جائے تو بہت کم مبالغہ آمیز ثابت ہوں گے اور اب تو پروڈا کا قانون بھی نہیں رہا۔

انسدادِ رشوت ستانی کے تحت کارروائیوں کے باوجود اعلیٰ سے ادنیٰ ملازمتوں تک رشوت ستانی کا بازار گرم ہے۔ اعلیٰ حکام تو بہت کم (اپنے اثر و رسوخ اور چند در چند اسباب کی بناپر) پکڑے جاتے ہیں لیکن جس قدر بھی لوگ رنگے ہاتھوں پکڑے جاتے رہے ہیں ان کی مثال اس دعوے کی تصدیق کے لئے کافی ہے کہ سرکاری حکام دولت اور جائداد۔ جو کارخانوں میں حصوں کی شکل میں ہے یا عمارتوں کی شکل میں یا کسی اور شکل میں۔ ہرگز شک و شبہ سے بالا نہیں۔

ہفت روزہ "لیل و نہار"

۱۳ اپریل ۱۹۵۸ء

بے شمار رقص کرتے ہوئے جسم، تھرکتے کانپتے ہوئے جسم، بتدریج ایک دوسرے میں پیوست ہوتے جا رہے تھے۔ خاموشی سے رقص سرور کا تماشہ دیکھنے والے کمرے کے ایک تنہا گوشے میں چلے گئے تھے۔ اس نے دیکھا، اُس کے ملک کے ایک لڑکی موسیقی کی دھن پر ٹوئسٹ کر رہی ہے۔ اس کے لبوں پر ہلکی ہی مسکراہٹ آگئی، اس نے سوچا، خود فریبی کا یہ سارا ہنگامہ کتنی دیر جاری رہے گا۔

ایک دلکش لڑکی نے جسے دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ یہاں آنے سے پہلے گھنٹوں آئینے کے سامنے کھڑی رہی ہوگی۔ اُس کے قریب آکر کہا "کیا تم آج بھی "اسرائیل" واپس جانے کے خیال سے لطف اندوز ہوتے ہو؟" اس کے الفاظ سادہ اور جارحانہ جذبے سے پاک تھے۔

"فرض کیجیئے گا آپ کا پرانا نام ڈمیونسکی ہے اور آپ اسے پسند نہیں کرتیں۔ چنانچہ آپ نے اپنا نام تبدیل کرنے کا فیصلہ کر لیا، مگر لوگ آپ کو اسی پرانے نام سے یاد کرینگے جو آپ کے بچپن میں رکھا گیا تھا۔ پوری دنیا یہ بات جانتی ہے کہ اس علاقے کو فلسطین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ہم محض فلسطین واپس جانے کے بارے میں سوچتے ہیں اور سوچتے ہی نہیں عملاً بھی اس بات کی کوشش کرتے ہیں۔ میں یہاں اس لئے نہیں آیا کہ ایک مقرر کی طرح آپ لوگوں سے خطاب کروں۔ اور کہوں کہ ہم ہر قیمت پر واپس جائیں گے۔ لیکن ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ ایک دن ہم یقیناً اپنے وطن کو واپس لوٹیں گے۔"

رونالڈ بڑی خاموشی سے سگریٹ پیتا رہا۔ اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ ابراہیم نے یونیورسٹی کے دوسرے سال میں رونالڈ سے شناسائی پیدا کی تھی۔ دونوں اکثر و بیشتر قریبی کافی ہاؤس میں اکٹھے جاتے تھے اور بے شمار موضوعات پر گفتگو کرتے تھے۔ رونالڈ اس کے ہموطنوں کی طرح اس کا حقیقی دوست بن گیا تھا۔

ابراہیم اپنے مخصوص انداز میں سگریٹ کے کش کھینچ رہا تھا۔ اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں لمبی چونچ جیسی ناک والے نوجوان پر مرکوز کر رکھی تھیں۔ بالآخر لمبی ناک والا بول اُٹھا۔

" واپسی، ہا ہا۔۔ ہا ہا۔ تاریخی طور پر یہ ہمارا ملک ہے۔ ہم وہاں ہزاروں سال سے رہتے آئے ہیں۔ اور اب ہم دوبارہ اس جگہ واپس ہوتے ہیں۔"

ابراہیم اس کے چبھتے ہوئے جملے اور لہجے پر پریشان نہ ہوا۔ وہ بخوبی واقف تھا کہ اگر اس نے اپنا ذہنی توازن کھو دیا تو اس کی بات پر کوئی دھیان نہیں دے گا۔ اس درمیان میں رونالڈ نے لمبی ناک والے کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "صبر، صبر کرو ڈیوڈ ورنہ یہاں ہر شخص تم پر بے تحاشہ ہنسنا شروع کر دے گا۔" اور پھر کسی کی جانب دیکھے بغیر دہسکی کی چسکیاں لینے لگا۔ میدان کارزار کھلا ہوا تھا۔ ابراہیم خاموشی سے رونالڈ کی آواز کا منتظر تھا۔ رونالڈ نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ تم نے واقعات اور حالات کا صحیح تجزیئے کئے بغیر بڑی عجلت میں تاریخ کا مطالعہ کیا ہے فلسطین میں تم، ایک دوسری مملکت کے ماتحت، فرد کی حیثیت سے زندگی گذارتے تھے شائد تم یہ کہو کہ تم سب حضرت سلیمان کی عملداری میں تھے۔ لہذا تمہیں اس علاقے میں رہنے کے حقوق حاصل ہیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ بین الاقوامی قانون تبدیل کر دیا جائے اس طرح تو ہر ملک کو اس بات کا حق پہنچتا ہے کہ وہ دوسرے ملک پر فوج کشی کر دے جہاں اس کے باشندے رہتے ہیں۔ ہمیں فوری طور پر اسپین پر چڑھائی کر دینا چاہیئے جہاں ہماری حکومت تھی اور حکومت کی مدت ایک ہزار سال سے کم نہ تھی۔"

ایک دوسرا مخمور آنکھوں والا نوجوان "کارزار" میں فوراً کود پڑا۔ "ڈیوڈ کی باتوں کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ وہ دراصل کہنا چاہتا تھا کہ اسرائیل اس وقت سے یہودیوں کا وطن ہے جب سے وہ صحرا میں گم ہوئے تھے۔"

تو پھر عیسائیوں کو فلسطین میں جمع ہو کر اپنی ریاست قائم کر دینی چاہیئے، کیونکہ حضرت عیسیٰ ؑ اسی جگہ پیدا ہوئے تھے

رونالڈ اس بات پر پھٹ پڑا، اس نے اپنے ہونٹوں سے وہسکی کا گلاس ہٹا کر ایک طرف رکھ دیا۔ "اگر اس منطق کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر عیسائیوں کو فلسطین میں جمع ہو کر اپنی ریاست قائم کر دینی چاہیئے۔ کیونکہ حضرت عیسیٰ اس جگہ پیدا ہوئے تھے اور اسی علاقے میں وہ صلیب پر چڑھائے گئے تھے۔ ہمیں انڈونیشیا، پاکستان اور یہاں تک کہ چین کے مسلمانوں سے بھی یہ توقع کرنی چاہیئے کہ وہ سعودی عرب میں جمع ہو کر اپنی حکومت قائم کر دیں۔ یہ صورتحال کسقدر تکلیف دہ ہوگی۔ جہاں تک میرے علم اور شعور کا تعلق ہے، میں اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتا، نہ ہی اس کا حق ماہرین قانون کو دیا جا سکتا ہے۔"

رونالڈ نے ابراہیم کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ "تمہارا کیا خیال ہے، ابراہیم"۔ "ہمیں بدھ مت کے ماننے والوں سے بھی کہنا چاہیئے کہ وہ ہندوستان میں اکٹھا ہو جائیں۔ بیشتر ملک شہریوں سے خالی ہو جائیں گے اور پوری دنیا ایک بدترین نراجیت اور ہنگامے کی ریاست میں تبدیل ہو جائے گی۔"

دو نوجوان آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ ایک خوبصورت لڑکی نے بڑی دلآویز مسکراہٹ سے ابراہیم کے چہرے پر نظر ڈالی۔ رونالڈ نے شراب کی ایک بڑی گھونٹ بھری۔ پورا کمرہ موسیقی کے زیر و بم میں ڈوب گیا۔ ابراہیم نے دوسری سگریٹ جلالی تھی۔ لمبی ناک والا نوجوان پہلو بدل کر اپنا سارا بوجھ دوسری ٹانگ پر ڈالے ہوئے کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ابراہیم کے چہرے پر مکمل اعتماد تھا اور اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ بشاشت اور تازگی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اُسے اس بات کا علم تھا کہ وہ یہاں سائنسی انداز میں مختلف موضوعات پر مدلل گفتگو کا طریقہ سیکھنے آیا تھا۔ یہاں جذباتی ہیجان یا غصہ مُضر ثابت ہوگا۔ اُس نے یورپ میں ٹھنڈے اعصاب کے لوگوں سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ لیکن یورپ اس کے اعتماد کو متزلزل نہ کر سکا۔ اُس نے اپنے آپ کو کچھ نوجوانوں سے یہ سوال کرتے ہوئے پایا۔"

"تم کہاں رہتے ہو ۔۔؟"

"میں کوہ کارمل کے نزدیک حیفہ میں رہتا ہوں۔"

ان میں سے ایک نوجوان نے جواب دیا۔ ناموں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ سارے نام ابھی تک عربی میں ہیں۔ عربوں کو معلوم ہے کہ ایک دن یہ ساری جگہیں ان کے ۔۔۔ ہوں گی، یہ علاقہ پھر ان کے لئے کبھی اجنبی نہیں بنے گا۔ اور فلسطین کا کوئی حصہ بنجر اور ویران نہ ہوگا۔ وہ اس بات کو خوب اچھی طرح سے محسوس کرتے ہیں کہ فلسطین کے علاقے ان سے بچھڑنے کے بعد اُداس ہیں۔ اس دن کا سورج بہت جلد طلوع ہونے والا، جس کی سنہری کرنوں کے سیلاب میں ماضی کی ناانصافیاں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غرق ہو جائیں گی۔ ابراہیم نے سوچا، کیا وہ جس جگہ رہتا تھا۔ وہاں کی گلیوں اور سڑکوں کے نام تبدیل کر دیئے گئے ہوں گے۔"

ابراہیم سے جب بھی کسی نے اسکے وطن کے بارے میں سوال کیا۔ اُس نے بے جھجک جواب دیا کہ "وہ عرب ہے اور عرب دنیا سے تعلق رکھتا ہے۔ جب کبھی کسی اکل کھرے پولیس والے نے اس سے پوچھا "تمہارے وطن کا کیا نام ہے؟ تب اُس نے یہی جواب دیا۔ "میں فلسطین میں پیدا ہوا تھا، میرا وطن فلسطین ہے۔ سیکورٹی پولیس والے اکثر اس سے بدتمیزی سے پیش آتے اور اس کے شانوں کو زور زور سے جھنجھوڑتے ہوئے کہتے "تم ہر جگہ تخریبی کام کرنے کے عادی ہو، تم جیسے لوگوں کو ایک جگہ جمع کرنا چاہیئے اور پھر وہاں سے ایک کو بھی باہر نکلنے کی اجازت نہیں دینی چاہیئے۔"

ابراہیم مغموم مسکراہٹ سے پولیس والے کی جانب دیکھتا اور اسکی کم علمی پر افسوس کرتا۔ اسے کیا معلوم کہ ہر عرب نوجوان اپنے وطن سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ جہاں وُہ پیدا ہوا۔ وطن واپس جانے کی آرزو میں اُس کے جسم کا ایک ایک حصّہ انتظار کے پہاڑ کاٹ رہا ہے۔ اس میں ان بیچارے پولیس والوں کا کیا قصور، جنہوں نے اپنی رُوح کو سرکاری یونیفارم سے ڈھک لیا ہے۔ کیا انہیں یہ علم نہیں کہ یورپ میں رہنے والا ہر عرب نوجوان آنے والے کل کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ اُس کل کے لئے وہ دن، رات کوشاں ہے۔ جب اسکے قدم فلسطین کی سرزمین میں ہوں گے۔

اچانک رونالڈ کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

کہاں گُم ہو گئے، ابراہیم ؟

" اوہ، میں اپنے وطن کے بارے میں سوچنے لگا تھا:

رونالڈ کمرے کے ہجوم میں کہیں گم ہو چکا تھا، ابراہیم خاموشی سے اسرائیلی لڑکی کو موسیقی کے دھن پر رقص کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ بیشمار نوجوان اس پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ ہر نوجوان کا ہاتھ اسکی کمر کے گرد پہنچنے کے لئے بےچین تھا۔ اور وُہ وارفتگی کے عالم میں ایک بازو سے دُوسرے بازو میں جھُول رہی تھی۔

ایک نوجوان نے ابراہیم کو رقص کرنے کی دعوت دی۔ مگر ابراہیم نے انکار کر دیا۔ وہ نوجوان دوبارہ رقص گاہ میں گم ہو گیا۔ نہیں، ہرگز نہیں، میں اس وقت تک کسی تفریح میں حصّہ نہ لوں گا جب تک فلسطین کے کھیت اس کے اپنے فرزندوں کے ہاتھوں سے سیراب نہ ہوں گے۔

- کیا تم میرے ساتھ رقص کرنا پسند کرو گے ؟" ایک انتہائی حسین لڑکی نے اس کے قریب آکر سوال کیا۔

ابراہیم کی نگاہوں کے سامنے اس کے بے شمار دوست گھومنے لگے جو اخبارات کے دفتروں میں اپنی میز کے پیچھے کام کرنے میں مصروف تھے، اس کی دُکھیا ماں بڑی حوصلہ مندی سے حالات کا مقابلہ کرتی ہوئی نظر آئی۔ اور بہن بھائیوں کے چہرے بھی گھومنے لگے جو اپنی قلیل تنخواہ سے ہر ماہ تعلیمی اخراجات کے لئے اسے روپے بھیج رہے تھے۔

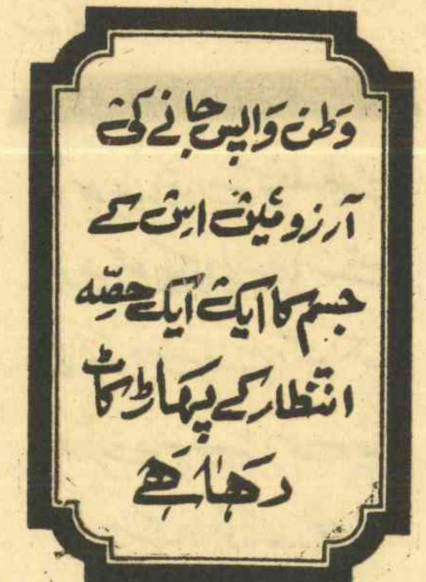
" اگر آپ کے ساتھ رقص کرنے سے میرے خیالات میرا تعاقب کرنا چھوڑ دیں تو مجھے رقص کرنے میں کوئی عذر نہیں"

حسین تتلی نے اسے ترحّم بھری نظروں سے دیکھا اور اسے اسی حالت میں چھوڑ کر کسی دوسرے نوجوان کو دعوت رقص دینے کے لئے روانہ ہو گئی۔ رونالڈ اس سے دور تھا، وہ ان لوگوں سے میلوں دور تھا۔

ابراہیم سگریٹ کے کش لگاتا ہوا خاموشی سے نوجوان جوڑوں کو رقص کرتا ہوا دیکھتا رہا۔ بائیں جانب ایک گوشے میں اسے ایک لڑکی بیٹھی ہوئی نظر آئی۔ وہ اسی کی طرح تنہا اور اداس تھی۔ اُسے لڑکی کا چہرہ شناسا دکھائی دیا اس نے آگے بڑھ کر رسمی انداز میں "ہیلو" کہا۔ لڑکی نے اسے مُڑ کر دیکھا اور کئی لمحے ٹکٹکی باندھ اُسے گھورتی رہی لڑکی نے کہا: " میرا خیال ہے کہ ہم پہلے بھی کہیں مل چکے ہیں؟"

ابراہیم نے قریب سے لڑکی کو دیکھ کر پہچان لیا اور خوشی سے چلایا " ہماری ملاقات یونیورسٹی کے ریستوران میں ہوئی تھی، جہاں ہم نے فلسطینیوں کی جد وجہد آزادی پر گھنٹوں گفتگو کی تھی۔

وہ برمنگھم کی رہنے والی ایک برطانوی لڑکی تھی یہاں انگریزی ادب کی تعلیم حاصل کر رہی تھی عربوں کی تحریک سے بہت زیادہ متاثر تھی، کیتھولک عقیدہ رکھنے کی وجہ سے وہ مذہبی کتابوں میں بڑی دلچسپی لیتی تھی اور اپنے شہر سے



بے پناہ محبت کرتی تھی اور اپنے غریب باپ سے والہانہ عقیدت رکھتی تھی جو ریلوے اسٹیشن پر کام کرتا تھا جب وہ برمنگھم یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھی تو اس کی ملاقات ایک عرب نوجوان سے ہوئی وہ اس نوجوان کی محبت میں گرفتار ہو گئی عرب نوجوان اپنی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد فلسطین چلا گیا اور فلسطینیوں کی تحریک آزادی میں شامل ہو گیا اور وہ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے یہاں چلی آئی ابراہیم کو اس لڑکی کا نام یاد آگیا۔ جینا۔

جینا نے کہا: میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد فلسطین چلی جاؤں گی۔ میں نے احمد سے وعدہ کیا ہے۔"

ابراہیم نے اس کے شانوں کو تھپتھپاتے ہوئے کہا " تم اپنا وعدہ پورا کرنا میں اپنا وعدہ پورا کروں گا۔ ہم دونوں ایک دن فلسطین واپس جائیں گے۔

چوہے جیسی ناک والا نوجوان پھر نمودار ہوا، اس نے جینا سے رقص کرنے کی درخواست کی، مگر جینا نے ایک نظر ابراہیم کو دیکھنے کے بعد اس کی درخواست ٹھکرا دی اور ابراہیم کا ہاتھ پکڑ کر رقص گاہ میں داخل ہو گئی۔ ارکسٹرا سے دبیکا کی دھن شروع ہو چکی تھی۔ اس رقص میں رقاص ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر دائرے کی صورت میں ناچتے ہیں "یہ رقص ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت شروع کیا گیا ہے" ابراہیم نے سوچا۔

ایک نوجوان نے اپنا ہاتھ ابراہیم کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ہم سب کو اس رقص میں شامل ہونا چاہیئے یہ ہمارے وطن کا ہے نوجوان نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیا، مگر جینا نے بڑی سرد مہری سے اپنے ہاتھ کھینچ لئے اور خاموشی سے ایک طرف کھڑی ہو گئی۔

تم لوگ مکروفریب اور چوری کے عادی ہو چکے ہو۔ سب سے پہلے تم نے زمین چرائی" اور ڈھٹائی" سے اس کا نام تبدیل کرنے کی کوشش کی اور اب اس رقص کو بھی ہتھیا لیا اور کہنے لگے کہ اس کا تعلق ہمارے وطن سے ہے"۔

جینا کے علانیہ جہاد سے انہیں سانپ سونگھ گیا۔ وہ اپنی اپنی جگہوں پر کھڑے حیرت اور تعجب سے جینا کا منہ تک رہے تھے، ہاتھوں کی زنجیر ٹوٹ کر بکھر گئی تھی۔ رونالڈ کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی اور اس کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔ ابراہیم تشکر آمیز نگاہوں سے جینا کی جانب دیکھ رہا تھا ایک لڑکی نے جینا کی طرف بڑھتے ہوئے انتہائی تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔

"ہم نے اس سرزمین کی چوری نہیں کی ہے اسے طاقت سے حاصل کیا ہے۔ اور اب کوئی شخص اس زمین کو ہم سے واپس لینے کی جرأت نہیں کر سکتا ہے" ۔ ابراہیم جینا کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے رنگ میں داخل ہو گیا۔

کیا تمہیں صلیبی جنگ یاد ہے یورپ کی افواج نے اس زمین پر زبردستی قبضہ کر لیا اور عرصہ دراز تک وہاں قیام کیا۔ اس کے بعد کیا ہوا، آخر کار ہماری زمین ہمیں واپس مل گئی اور ہم دوبارہ آباد ہوئے"۔

تحقیر اور غصّہ کے عالم میں کوئی زور سے چیخا۔ لیکن اس مرتبہ یہ زمین تمہیں واپس نہیں ملے گی۔

" یہ تمہارا خیال ہے ہم دوسری رائے رکھتے ہیں آنے والے دن بتائیں گے کہ زمین ہمیں واپس ملے گی یا ان لوگوں کے پاس رہے گی جنہوں نے زبردستی اس پر قبضہ جما لیا ہے۔ دوستانہ طور پر میں ایک بات کہتا چلوں کہ اس مسئلے پر میں چیخنا چلانا پسند نہیں کرتا اگر تم صبر و تحمل کے ساتھ بحث کرنا چاہتے ہو تو آؤ ایک طرف بیٹھ جائیں اور اس موضوع

(باقی صفحہ ۲۸ پر ملاحظہ فرمائیں)

فارغ بخاری

ڈاکٹر مظہر علی خان ادبیات کے بےمثل استاد اور عالمِ باعمل تھے

ڈاکٹر صاحب
کی موت ایک عالم اجل ایک
شفیق استاد ایک باصفا انسان
ایک باغ و بہار شخصیت اور
ایک آشفتہ نوا سخنور کی
موت ہے

وہ ہر مظلوم اور محرومِ انصاف کے وکیل بن جاتے تھے

"بنی نوعِ انسان کی خدمت سب سے بڑی عبادت ہے دُنیا میں تو اس کا اجر ملتا ہی ہے اُس دُنیا میں بھی ایسے انسان کو حیاتِ جاودانی نصیب ہوتی ہے یعنی موت بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔"

یہ الفاظ پشاور یونیورسٹی کے ڈین آف فیکلٹی اور شعبۂ انگریزی کے چیئرمین ڈاکٹر مظہر علی خاں کے ہیں جو شاید انہوں نے اپنے ہی لئے کہے تھے اگرچہ آج وہ ہم میں نہیں لیکن ان کی باتیں زندہ ہیں، ان کی صحبتیں زندہ ہیں ان کے علمی ادبی کارنامے زندہ ہیں ان کا مکتبۂ فکر زندہ ہے اور جب تک یہ چیزیں موجود ہیں موت کا آہنی ہاتھ انہیں ہم سے جدا نہیں کر سکتا۔

پشاور یونیورسٹی میں سینیٹ کی میٹنگ ہو رہی ہے۔ مسئلہ یہ درپیش ہے کہ یونیورسٹی کا بجٹ خسارے میں جا رہا ہے۔ اس خسارے کو پورا کرنے کے لئے اخراجات میں کمی کرنے کی ضرورت ہے بعض دوسرے اخراجات کم کرنے کے علاوہ ایک تجویز یہ سامنے آتی ہے کہ ہر شعبے سے دو دو چپڑاسی کم کر دیئے جائیں اس طرح تیس چپڑاسیوں کے نکال دینے سے تین ہزار روپے کی بچت ہو سکتی ہے تمام ممبر اس پر صاد کر دیتے ہیں۔ کوئی نہیں سوچتا کہ یہ صرف تیس چپڑاسیوں کا معاملہ نہیں، پورے تیس خاندان متاثر ہو رہے ہیں۔ ڈاکٹر مظہر علی خان تڑپ کر اُٹھتے ہیں "دوستو میری تنخواہ ان تیس چپڑاسیوں کے برابر ہے مجھے سبکدوش کر دیجئے۔ اس سے اتنی ہی بچت ہو جائے گی، لیکن خدارا ان تیس خاندانوں کو برباد نہ کیجئے۔ میں یہ کبھی برداشت نہیں کروں گا کہ ان بے گناہوں کے خون سے ہمارے ہاتھ رنگے جائیں۔"

سینیٹ کے تمام ممبر حیران و پریشان ہو کر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگتے ہیں اور آخر ڈاکٹر صاحب سے معذرت کرتے ہوئے یہ تجویز واپس لے لی جاتی ہے۔ یہ تھے ڈاکٹر مظہر علی خاں جو پوری یونیورسٹی میں ہمیشہ جرأتِ اظہار، انصاف اور عدل کا نشان بنے رہے۔ وائس چانسلر سے لے کر رجسٹرار تک ان کی حق گوئی اور بے باکی سے خائف رہتے، ان کے سولہ سالہ عہد میں کوئی ایک مثال ایسی نہیں ملتی کہ انگلش ڈیپارٹمنٹ میں کسی غیر مستحق لڑکے کو داخلہ ملا ہو یا کوئی مستحق طالبِ علم محروم رہا ہو ان سے اس قسم کی سفارش کرنے کی کسی کو جرأت ہی نہیں ہو سکتی تھی اکثر کہا کرتے تھے کہ مجھ سے کوئی ناجائز کام میرے برادرِ بزرگوار تک بھی نہیں کرا سکتے۔ ہر مظلوم ہر محروم اور بے انصافی کے شکار ہر شخص کے وکیل بن جاتے اور اس کے لئے انصاف حاصل کرنے میں اپنی ملازمت تک خطرے میں ڈال دیتے۔

انگریزی سے انہیں پیشہ ورانہ لگاؤ تھا عربی سے عقیدت تھی، فارسی سے عشق تھا، اُردو گھٹی میں پڑی تھی۔ ان چاروں زبانوں کے پورے ادب پر ان کی گہری نظر تھی۔ ان زبانوں کے شعر و ادب کا جس قدر متبادل عالمانہ مطالعہ وہ رکھتے تھے، علمی دُنیا میں بہت کم ایسی مثالیں ملتی ہیں بیدل نظیری، حافظ، غالب اور اقبال کے تو حافظ تھے شعر پڑھنے کا مخصوص انداز اور خطابت کے جوہر انہیں ورثے میں ملے تھے دُنیا کے ہر موضوع پر گھنٹوں بے تکان بولتے اور خطابت کا یہ عالم کہ مجمع کو ایک فقرے میں ہنسانا اور دوسرے فقرے میں رُلا دینا ان کا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ لوگ ان کی آواز کے زیر و بم، چہرے کے اُتار چڑھاؤ اور ہاتھوں کی طلسماتی جنبش میں کھو کر رہ جاتے اس پر مدلل رواں دواں اور موثر تقریر جس میں جگہ جگہ عربی فارسی اُردو اور انگریزی اشعار کی چاشنی — جیسے ٹھاٹھیں مارتا ہوا بحرِ ذخار ہے جس کے آگے بند باندھنا محال ہو۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم اس شہر میں ایک چراغ ہی نہیں روشنی کا مینار تھے۔ جہاں کہیں کسی کو کوئی ادبی علمی یا لسانی مسئلہ درپیش ہوتا، یونیورسٹی کے تمام علماء فضلاء ان ہی سے رجوع کرتے، کوئی علمی، ادبی محفل ان کی شرکت کے بغیر نامکمل سمجھی جاتی اور کوئی جلسہ ان کی صدارت کے بغیر کامیاب نہیں کہلاتا تھا۔ کوئی اچھا شعر، اچھا فقرہ سُن کر تڑپ جاتے، بار بار پڑھواتے اور جی کھول کر داد دیتے۔ آپ کی فارسی اور انگریزی کی قابلیت کا اس امر سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک عرصہ تک تہران یونیورسٹی میں فارسی اور انگلستان کے تعلیمی اداروں میں انگریزی کا درس دیتے رہے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم پچھلے دو برس سے عارضۂ قلب میں مبتلا تھے دل کا پہلا دورہ ۱۸ ماہ پیشتر اس وقت پڑا جب آپ وزٹنگ پروفیسر کے طور پر یورپ گئے تھے وہاں سے واپسی پر ماسکو کے ہوائی اڈہ پر آپ کو اچانک تکلیف شروع ہوئی اور ایک عرصہ تک زیرِ علاج رہے۔ اس دفعہ

دو ہفتے قبل آپ کراچی سے پروگریسیو پیپرز لمیٹڈ کے بورڈ آف ڈائرکٹرز کے اجلاس میں شرکت کی غرض سے لاہور آرہے تھے کہ طیارہ ہی میں آپ پر حملہ ہوا اور حالت غیر ہو گئی۔ آپ کو لاہور میں فوراً یونائیٹڈ کرسچین ہسپتال پہنچایا گیا لیکن ڈاکٹروں کی انتہائی کوشش کے باوجود جانبر نہ ہو سکے اور یکم جنوری کی صبح ہسپتال میں انتقال کیا۔

ڈاکٹر مظہر علی خاں مشہور شیعہ عالم علامہ رشید ترابی کے بھائی اور نصیر ترابی کے چچا تھے آپ حیدرآباد دکن کی سرزمین سے تعلق رکھتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد اپنے خاندان کے دیگر افراد کے ساتھ پاکستان آئے۔ ۱۶ برس پہلے پشاور یونیورسٹی سے منسلک ہوئے، تقسیم سے پہلے متحدہ ہندوستان میں کئی یونیورسٹیوں میں ادبیات کے اُستاد رہے اس کے علاوہ اس وقت کی مرکزی حکومت میں بھی بعض اعلیٰ عہدوں پر کام کرتے رہے، پشاور یونیورسٹی میں آنے سے پہلے آپ ملٹری اکیڈیمی کاکول میں انگریزی ادبیات پڑھانے کے فرائض انجام دیتے رہے۔

جہاں تک پشاور یونیورسٹی کا تعلق ہے ڈاکٹر صاحب مرحوم کا شمار اس یونیورسٹی کے معماروں میں ہوتا ہے، دُنیا بھر میں اس یونیورسٹی کی ساکھ قائم کرنے میں آپ کی خدمات ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ آپ یونیورسٹی کی طرف سے تدریس کے سلسلہ میں متعدد بار ایران، مصر، عراق اور یورپ کے مختلف ممالک کے دورے پر جاتے رہے۔ بارہا بین الاقوامی تعلیمی کانفرنسوں میں پاکستان کی نمائندگی کر کے علمی و ادبی دُنیا سے اپنے علم و فضل کا لوہا منوایا۔ درس و تدریس اور ادب و فن سے آپ کے قلبی لگاؤ کا یہ عالم تھا کہ اس کے لئے عمر بھر شادی نہ کی اور تنہا زندگی گذارتے رہے تاکہ ان کے ان محبوب مشاغل میں فرق نہ آنے پائے اور آپ کی خلوت میں کوئی مخل نہ ہو۔

انہیں خراجِ تحسین پیش کیا گیا

ریڈیو پاکستان سے آپ کی اچانک وفات کی خبر سُنتے ہی پشاور کے علمی ادبی ثقافتی اور تعلیمی حلقوں میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ پشاور یونیورسٹی اس دن سوگ میں بند رہی۔ تمام سیاسی ادبی اور تعلیمی رہنماؤں نے اپنے تعزیتی پیغامات میں آپ کو بھرپور خراجِ تحسین پیش کیا۔ طلباء کی یونینوں اساتذہ کی تنظیموں اور تمام ادبی اداروں نے تعزیتی قراردادوں میں آپ کی ادبی، تعلیمی اور ثقافتی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے آپ کی وفات کو مُلک کا ناقابلِ تلافی نقصان ظاہر کیا۔

ڈاکٹر صاحب کی موت ایک عالم اجل، ایک شفیق اُستاد ایک مہذب اور با اخلاق انسان، ایک باغ و بہار شخصیت اور ایک آتش نوا مقرر کی موت ہے ان کے انتقال سے جو خلاء پیدا ہوا ہے وہ شاید مدتوں پُر نہ ہو سکے گا۔

مشرقی حصے سے روشنی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں

بقیہ صفحہ ۲۷ سے آگے

یہ دل کھول کر بات کریں اگر تم چیخنے چلانے کے شوقین ہو تو میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ قریبی ہائیڈ پارک میں چلے جاؤ اور اپنے دل کی بھڑاس نکال ڈالو۔"

ابراہیم اتنا کہنے کے بعد خاموش ہو گیا۔ اور سگریٹ سلگا کر پینے لگا۔ اس نے محسوس کیا اس کے ارد گرد کھڑے ہوئے نوجوانوں نے زرہ بکتر زیب تن کر لی ہے۔ اور اپنے چمکیلے ہتھیاروں سے اسے بار بار للکار رہے ہیں" مارو۔ مارو کا شور بلند ہو رہا ہے۔ اس وقت جانے کیوں اسے اپنا وہ بھائی بھی یاد آ گیا جسے بغاوت کے الزام میں گرفتار کر کے قید خانے میں زبردست جسمانی اذیتیں پہنچائی گئی تھیں، اس کا قصور محض اتنا تھا کہ وہ نوجوانوں کی ایک پارٹی بنا کر انہیں جنگی مشقیں کرایا کرتا تھا، اس نے اپنے ان بھائیوں کو معاف کر دیا تھا جو اس کی گرفتاری کے باعث بنے تھے۔ کیونکہ ان کے ملک میں بھی عربوں کے پرچم لہرا رہے تھے۔ وہ اس کے عرب بھائی تھے مگر امریکی سامراج

> اس کا قصور محض اتنا تھا کہ وہ نوجوانوں کی پارٹی بنا کر انہیں جنگی مشقیں کرایا کرتا تھا

کے اشاروں پر ناچ رہے تھے، جیل سے رہا ہونے کے بعد اس نے ابراہیم کو ایک خط لکھا تھا، جس میں اس نے کہا تھا۔

"ابراہیم، اس جنگ میں ہم تنہا نہیں ہیں ہمارے ساتھ لاتعداد مزدور کسان اور طالب علم ہیں جو ہر حال میں اپنے وطن کو بیرونی تسلط اور استحصال سے نجات دلانا چاہتے ہیں"

ابراہیم نے سوچا، اس کے بھائی کی طرح بے شمار فلسطینی آزادی کی خاطر اپنی جانیں قربان کر رہے ہیں۔ اس کے وطن کا چپہ چپہ لہولہان ہے۔ کیا ہماری قربانیوں سے ہماری زمین کے چہرے پر لگا ہوا زخم مندمل نہ ہو گا۔؟ مجھے یقین ہے، پورا اعتماد ہے کہ یہ زخم ہمیشہ کے لئے بھر جائے گا۔ اور پھر ہماری زمین کے سینے پر کبھی لہو کی بارش نہ ہو گی۔"

جینا نے آگے بڑھ کر ابراہیم کا ہاتھ تھام لیا اور کہا آؤ ہم رقص کریں، مجھے معلوم ہے خاموشی تمہیں ڈستی ہے

رات دبے پاؤں گذرتی رہی کمرے میں بے پناہ شور ہو رہا تھا۔ رونالڈ اچانک ایک اونچی جگہ کھڑا ہو گیا اور بلند آواز میں نوجوان جوڑوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولا خواتین و حضرات، بس ایک منٹ" اس نے اپنا جام لہراتے ہوئے کہا۔ رات ٹوٹتی بکھرتی جا رہی ہے۔ بس کچھ ہی دیر میں روشنی پھوٹنے والی ہے تاریکی چھٹ جائے گی آیئے اس بھاگتی ہوئی تاریکی اور پھیلتی ہوئی روشنی کے درمیان ایک مقدس چیز کے نام پر آخری گھونٹ بھر لیں۔"

اتنا کہنے کے بعد رونالڈ نے ان لوگوں کی جانب بڑی گہری اور معنی خیز نظروں سے دیکھا جو تذبذب کے عالم میں اسے دیکھ رہے تھے جینا اور ابراہیم کی دلچسپی بڑھ گئی تھی۔

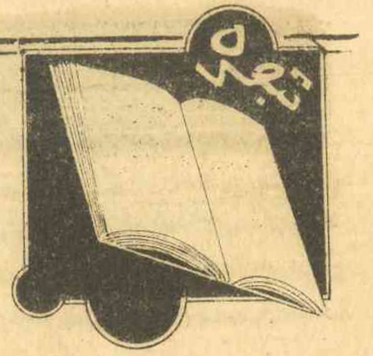
رونالڈ نے فضا میں اپنا جام لہرایا "ابراہیم کے عزیز وطن فلسطین کے نام پر" ۔ اور یہ کہتے ہوئے اس نے جام کو اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ جینا خوشی سے ناچ اٹھی اور اس نے بڑھ کر ابراہیم کے ہونٹوں کو چوم لیا۔ رات ختم ہو رہی تھی، مشرقی حصے سے روشنی کی ہلکی ہلکی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ رقص کرنے والے تھک گئے تھے اور اب واپسی کی تیاریوں میں مصروف تھے۔

لمبی چوٹی والے نوجوان نے ابراہیم سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "ہماری ملاقات اسی طرح ہوتی رہے گی۔ پارٹیوں میں۔"

ہاں اسی طرح، مگر آخری بار ہماری ملاقات کسی خندق میں یا محاذ پر ہو گی، جہاں ہم دونوں اپنی آرزوؤں کی تکمیل کریں گے۔"

لمبی چوٹی والا نوجوان جھلاتے ہوئے انداز میں کمرے سے باہر نکل گیا۔ ابراہیم نے ایک نظر ان لوگوں کی جانب دیکھا جو اسے پیار بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے، ان کی تعداد خاصی تھی اس کے کانوں میں اس کے بھائی کے جملے گونج رہے تھے۔ "ابراہیم ہم اس جنگ میں تنہا نہیں، ہر وہ شخص ہمارے ساتھ ہے جو ہمارے مقاصد کو سمجھتا ہے اور اس کی تکمیل میں کسی نہ کسی طرح ہمارے دوش بدوش چل رہا ہے۔

صبح کی حسین اور مسرور کرنیں کھڑکی پر کھڑی جھلملا رہی تھیں



ماہنامہ

افکار

کراچی

(مصطفیٰ زیدی ایڈیشن)

مدیر : صہبا لکھنوی

صفحات : ۳۰۰ سے زائد

قیمت : چار روپے

مکتبۂ افکار - رابسن روڈ - کراچی

مصطفیٰ زیدی کے بارے میں کتب ورسائل میں بہت کم لکھا گیا اور اخباری رپورٹوں میں بہت زیادہ۔ گفتنی اور ناگفتنی کی شرط نہیں رہی۔ افسوس کہ اتنا ذہین اور خوش طبع شاعر اور یوں رسوا ہو۔ صہبا صاحب نے افکار کا خاص شمارہ مرتب کر کے اس کی تلافی کر دی۔ عصر حاضر کے ایک نہایت طبّاع، طرحدار اور بانکے شاعر اور منفرد شخصیت کو سمجھنے اور سمجھانے اور ادب کے قارئین سے اسے متعارف کرانے کی یہ کوشش بڑی مبارک ہے۔

صہبا صاحب نے شخصیتوں کے خاص شمارے بڑے اہتمام سے شائع کئے ہیں، مجاز، حفیظ، فیض اور جوش نمبر بلاشبہ ایسی قیمتی ادبی دستاویز ہیں کہ ان شعرا پر مزید تنقید اور تحقیق، کے لئے ان کا مطالعہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ یہ سب بہت بڑے شاعر بلکہ اپنی اپنی طرز کے امام ہیں۔ ادب کے قارئین ان کے بارے میں یوں بھی بہت کچھ جانتے ہیں۔ لیکن مصطفیٰ زیدی ابھی اپنی عمر کے اس مرحلے میں داخل نہ ہوئے تھے، جہاں شہرتِ عام بجائے خود ان کا تعارف بن جاتی۔ ناقدوں نے ان کے کلام کو اور وقائع نگاروں نے ان کے احوال کو ابھی تنقید اور تحقیق کا مستحق اس لئے نہیں جانا تھا کہ ابھی ان کی عمر ہی کیا تھی۔ لیکن اب کہ مصطفیٰ زیدی ہمارے درمیان نہیں رہے۔ معلوم یہ ہوا کہ انہوں نے سرکاری ملازمت کی غیر شاعرانہ مصروفیات کے باوجود چپکے چپکے چھ شعری مجموعے مرتب کر لئے تھے اور تخلیق کا یہ عمل پوری تیزی و تندہی کے ساتھ جاری تھا۔

افکار کے خاص شمارے میں فاضل مرتّب نے کم و بیش وہ سارا مواد یکجا کر دیا ہے، جس کی ضرورت زیدی کے شناساؤں اور شیدائیوں کو محسوس ہو سکتی ہے۔ زیدی کے خطوط، سوانحی حالات ان کے کلام پر ناقدانہ تبصرے، احباب کی یادداشتیں، طربناک بھی الم ناک بھی۔ جن میں زیدی کی شدید حساس، دل گرفتہ اور شکستہ شخصیت کے خدوخال نمایاں ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ زیدی کے متعلق معاصرین کے مقالے۔ کلام کا انتخاب مطبوعہ بھی غیر مطبوعہ بھی اور ان کے درمیان زیدی کی متعدد تصویریں، شاعروں محفلوں اور احباب واعزّہ کے درمیان گروپ فوٹو۔ غرض کہ یہ اچھا مجموعہ ہے، جس میں ہم اپنے زمانے کے ایک ایسے شاعر سے متعارف ہوتے ہیں جو اپنی زندگی میں، بہت کم توجّہ کا مستحق سمجھا گیا اور مرتے ہی ایک خلقت کا مرکزِ توجّہ بن گیا۔ جس سے جیتے جی انصاف نہیں کیا گیا۔ لیکن مرتے ہی شدید بے انصافی برتی گئی،

زیدی کے یہ چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

کیسا حصار ہے جو مجھے چھوڑتا نہیں
میں کس طلسمِ ہوش ربا کے اثر میں ہوں
زنداں میں ہوں کہ اپنے وطن کی فصیل میں
عزّت سے ہوں کہ جسم فروشوں کے گھر میں ہوں

جدھر جدھر سے بھی گذرا جلوسِ رسوائی
کھڑے تھے لوگ دریچوں میں شمع داں کی طرح
لئے ہوئے مرے ناکردہ جرم کی فردیں
ہر ایک دوست ملا مرگِ ناگہاں کی طرح
بوقتِ قتل بہت دور میرے سارے عزیز
صف آزما تھے نگہبانِ آسمان کی طرح
جنوں کی آگ میں جل بجھ چکا ہے میرا وجود
میں اس کی راکھ سے ڈالوں کہاں کہاں کی طرح

(جلوسِ رسوائی)

ماہنامہ

نئی نسلیں

کراچی

ایڈیٹر - ذکاء الرحمٰن

صفحات - ۶۴ (۲۰×۳۰/۴)

قیمت - فی پرچہ ۱.۵۰ - زر سالانہ ۱۵ روپے

دفتر - الہلال ہاؤسنگ سوسائٹی - کراچی ۵

تعارف کے لئے نام کافی ہے۔ مزید صراحت کے لئے اداریے کا یہ فقرہ ملاحظہ ہو، "ماہنامہ نئی نسلیں" پاکستان کی انقلابی نئی نسل کا ترجمان، ساتھی ناقد اور رہنما ہے۔ ہم ماہنامہ "نئی نسلیں" کو ایک نئی تہذیب کی تخلیق کا طاقت ور عمل بنا کر پیش کریں گے۔ ہم ماہنامہ نئی نسلیں کی تمام قوتوں کو وہ انقلاب برپا کرنے کے لئے کھپائیں گے جو ہمیں یقین ہے، ایک نئی انسانیت کی تعمیر کرے گا"۔ پاکستان کی نئی انقلابی نسل کی حمایت کا اعلان کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ہم آمریت اور مذہبی اجارہ داروں، کے خلاف ہیں۔ اور اس نسل کے ساتھ ہیں جو یونیورسٹیوں کی ڈگریاں جلاتی ہے مظلوم کی نجات، کشمیر کی آزادی اور فلسطین و ویت نام کے گوریلوں کی حمایت کے لئے اپنا گرم لہو پیش کرتی ہے۔ اور جو حقیقت کی نئی تعریف کرتی ہے، عجیب وغریب لباس پہنتی ہے، عجیب غریب موسیقی کی دھن پر رقص کرتی ہے اور جو سٹیٹس (STATUS) اور سود کو تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہے۔

روائتی اندازِ فکر، قدامت اور معمولات پر اصرار، ہر نئی چیز سے اجنبیت اور تلخ حقائق سے گریز کی خو اور ان سب سے سوا ایک ریاکارانہ اخلاق پر اصرار، جس میں ہر طرح کی متضاد صورتِ حالات کے درمیان سمجھوتے کی گنجائش پیدا کر لی جاتی ہے۔ یہ ہے معاشرے کا وہ عام چلن جو نئی نسل کو ورثے میں ملا ہے لیکن نئی نسل نے اس ورثے کو ٹھکرا دیا ہے۔ فرزند آذر کی سنّت یہی ہے۔ زیرِ نظر ماہنامے کے فاضل مدیروں نے کوشش کی ہے کہ پاکستان میں نئی نسل کے تجسّس، بے باک اور آزاد ذہن کو اپنے صفحات میں جس حد تک ممکن ہو، سمیٹ لیں۔ اس مقصد کے تحت انہوں نے ماہناموں کے روایتی اسلوب سے بچتے ہوئے، پرچے کے حجم، موضوعات کی ترتیب اور لے آؤٹ میں بھی ندرت برتی ہے اور مضامین کے انتخاب میں بھی کاوش سے کام لیا ہے۔ ملکی اور بین الاقوامی سیاسی جائزہ، ادبی مقالے، کہانیاں، شاعری، آرٹ، مذہب، صنعت و معیشت، ٹیلیویژن، فلم، فیشن کے تحت ہر موضوع سے انصاف کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک دلچسپ عنوان "موجودہ سہ کل میں ہے" جس کے تحت احمد ہمیش نے منیر نیازی، قمر جمیل اور رئیس فروغ کی ایک ایک نظم کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ اس مطالعے سے نئی نسل کے تنقیدی معیار اور نئی شاعری کی علامتوں کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

"نئی نسلیں" میں ایک بات روایت کے عین مطابق ہے۔ اور وہ ہے افسانوں اور نظموں کے لئے زیادہ صفحات۔ جب کہ بعض مضامین، مثلاً نئی نسل کے مسائل" تشنہ رہ گئے اور فیشن کا باب لباس کے ایک دو نمونوں کی پیش کش سے آگے نہ بڑھ سکا۔ صنعت و معیشت کے زیرِ عنوان ان محرکات کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا سکتا تھا، جو مہنگائی کے موجب ہیں اور ان کہی باتوں کو کہنے کی ہمّت صرف نئی نسل پیدا کر سکتی ہے، لیکن مضمون نگار کا مشورہ "سرمایہ دار اور مزدور کے درمیان خوشگوار تعلقات" کی سطح سے اوپر نہ جا سکا۔

نئی نسل کے مسائل ان گنت ہیں۔ تعلیم اور روزگار کے مسائل، رہائش اور تفریح کے مسائل، جنس اور اخلاق کے مسائل، سیاست اور معیشت کے مسائل ہیں۔ امید ہے کہ اس ماہنامے کے فاضل مدیر، ان تمام عنوانات سے انصاف کریں گے۔ پاکستان کی نئی نسل، دنیا کے دوسرے ملکوں کی نئی نسل سے الگ نہیں ہے اس لئے عالمی تحریکوں اور تبدیلیوں کا احاطہ کرنے کے لئے نسبتاً زیادہ صفحات درکار ہوں گے۔ "نئی نسلیں" کا یہ پہلا شمارہ ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ آئندہ شمارے بدرجہا بہتر اور ان کے مندرجات کہیں زیادہ متنوع ہوں گے۔ جدت، جرأت، ذہانت اور ذوقِ لطیف، یہ چار خوبیاں، ان اوراق میں اب بھی موجود ہیں۔

رجعت پسند طاقتیں انتخاب میں ناکامی سے ختم نہیں ہو جاتیں

انقلابی قوتوں کی تنظیم اب تک نہیں ہو سکی

انتخابات کے نتائج کی روشنی میں دائیں اور بائیں بازو کی عوامی مقبولیت کا تجزیہ کرتے ہوئے میں نے گذشتہ مضمون میں اس طرف اشارہ کیا تھا کہ سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت میں انتخابات سیاسی شعبدہ بازی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ اس نظام میں انتخابات کا مقصد عوام کا استحصال کرنے کے لئے عوام سے سرٹیفکیٹ حاصل کرنا ہوتا ہے۔ کسی طبقاتی سماج میں انتخابات خواہ کتنے ہی منصفانہ کیوں نہ ہوں۔ لیکن محض انتخابات کے ذریعہ عوام کے مسائل کا حل ممکن نہیں ہمارے پڑوسی ملک ہندوستان میں پچھلے ۲۳ برس میں پانچ بار عام انتخابات ہو چکے ہیں لیکن ہندوستان کے عوام آج بھی اپنی بنیادی ضرورتوں سے محروم ہیں۔ ہندوستان ہی کی طرح دنیا کے بیشتر ملکوں میں انتخابات ہوتے رہتے ہیں۔ ان انتخابات کے بعد حکومت میں آنے والے افراد تو بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن عوام کے بنیادی مسائل بدستور موجود رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سرمایہ دار ملکوں میں حکومت کی ساری مشینری صرف استحصالی طبقوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے سرگرم رہتی ہے۔ دوسرے، انتخابات کا طریقہ ایسا ہوتا ہے کہ محنت کش طبقوں کا کوئی فرد انتخابی اخراجات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ عام طور پر انتخابات میں سرمایہ دار اور جاگیر دار ہی کامیاب ہوتے ہیں اور اسمبلیوں میں عوام کے مسائل حل کرنے کے بجائے اپنے طبقاتی مفادات کی حفاظت کرتے ہیں۔!

پاکستان کے حالیہ انتخابات میں عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی نے بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کی ہے۔ ان دونوں جماعتوں کی کامیابی کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ کامیاب ہونے والے امیدواروں میں خصوصاً عوامی لیگ میں درمیانہ طبقے کی اچھی خاصی تعداد شامل ہے۔ ہمارے بعض سیاسی مفکر درمیانہ طبقے کے افراد کی کامیابی سے بہت پر امید ہیں کہ اب پاکستانی عوام کے مسائل حل ہو جائیں گے۔ اسی طرح یہ لوگ دائیں بازو کی رجعت پسند جماعتوں کی شکست سے یہ سمجھ رہے ہیں کہ اب رجعت پسند جماعتوں اور استحصالی طبقوں کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے۔ انتخابات میں درمیانے طبقے کے بہت سے افراد نے کامیابی حاصل کی اور یہ ایک حوصلہ افزا بات ہے۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ عوام کی بھاری اکثریت نے سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور با اثر شخصیتوں کے خوف سے نجات حاصل کر لی۔ اسی طرح مذہب کے بڑے بڑے ٹھیکیداروں کی ناکامی سے خواہ وہ کسی جماعت کے امیدوار ہوں، یا آزاد امیدوار یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ عوام کی بڑی اکثریت مذہبی نعروں سے متاثر ہونے کے لئے تیار نہیں۔

اس انتخابات سے جو مثبت فائدے برآمد ہوئے ہیں وہ یہ ہیں۔

عوام کی شہری آزادیوں کی بحالی کا امکان پیدا ہوا ہے۔

عوام کے طرزِ فکر میں تبدیلی ظاہر ہوئی ہے۔

دائیں بازو کے مذہبی نعرے ناکام ہو گئے ہیں اور بائیں بازو کو عوام میں مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔

پاکستان میں سائنٹفک سوشلزم یا ایک غیر طبقاتی سماج کے لئے کام کرنے والوں کا فرض ہے کہ وہ انہیں حقائق کی روشنی میں آئندہ کے لئے اپنا طریقۂ کار طے کریں۔ سب سے پہلے ہمیں اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے کہ دائیں بازو کی رجعت پسند جماعتیں دوبارہ منظم اور متحد ہو کر میدانِ عمل میں آئیں گی۔ انتخابی شکست خواہ وہ کتنی ہی شدید کیوں نہ ہو، انہیں ختم نہیں کر سکتی۔ کیونکہ جب تک سماج میں استحصالی طبقات موجود ہیں اس وقت ان کی ترجمانی کرنے والے بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود رہیں گے۔ چین جیسے ملک میں جہاں ۲۱ سال سے پرولتاری آمریت قائم ہے۔ چینی رہنماؤں کو استحصالی طاقتوں کے دوبارہ سر اٹھانے کا مستقل خطرہ لاحق رہتا ہے اور چینی رہنما ان طبقوں کو دوبارہ اقتدار میں آنے سے روکنے کے لئے طویل ترین منصوبہ بندی اور اقدامات میں مصروف رہتے ہیں۔ جب یہ بات طے ہے کہ پرولتاری آمریت کے بعد بھی استحصالی طبقوں کے برسرِ اقتدار آنے کے امکانات موجود رہتے ہیں تو عوامی لیگ، پیپلز پارٹی اور درمیانے طبقے کے افراد کی انتخابات میں کامیابی سے ہمیں زیادہ خوش فہمیوں میں مبتلا نہیں ہونا چاہیئے۔

پچھلے مضمون میں، میں نے اس بات کی وضاحت کی تھی کہ کسی انقلابی قیادت کی عدم موجودگی سے جو خلا پیدا ہوا تھا، اُسے پیپلز پارٹی اور عوامی لیگ نے اگرچہ اپنے معاشی پروگرام اور پُر کشش لیڈر شپ کی وجہ سے پُر کر دیا ہے۔ لیکن وہ اپنے مخصوص طبقاتی کردار کی وجہ سے ملک کے معاشی ڈھانچے میں کوئی بنیادی تبدیلیاں لانے کی اہل نہیں جس کے نتیجے میں عوام ایک بار پھر مایوسی کا شکار ہو کر نئی قیادت تلاش کریں گے۔ اگر اس دوران میں پاکستان کی انقلابی قوتیں اپنے آپ کو منظم و متحد نہ کر سکیں، تو اس بات کا پورا امکان ہے کہ دائیں بازو کی رجعت پسند جماعتیں اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر ایک بار پھر عوام کے سروں پر مسلط ہونے کی کوشش کریں گی

انتخابی نتائج کے اعلان کے بعد سے اب تک کے حالات کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ انقلابی قوتوں کو منظم اور متحد کرنے کے سلسلے میں ابھی تک کوئی ٹھوس کوششیں نہیں ہو سکیں، بلکہ انقلابی صفوں میں انتشار کچھ زیادہ ہی بڑھتا نظر آ رہا ہے۔

پاکستان کا انقلابی عنصر سب سے زیادہ مولانا بھاشانی کی جماعت سے منسلک تھا لیکن مولانا بھاشانی کے حالیہ بیانات سے جن میں آزاد بنگال کا نعرہ شامل ہے۔ نیپ مغربی پاکستان ٹوٹ کر رہ گئی ہے۔ نیپ بھاشانی گروپ کے وہ قائدین جن کا محبوب مشغلہ بیان بازی رہا ہے، اب اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیئے کوئی نیا سہارا تلاش کرنے میں مصروف ہیں ان حضرات کی سرگرمیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی نئے نام سے نیپ ہی کی طرز کی ایسی پارٹی بنانا چاہتے ہیں جس کی قیادت ان کے ہاتھوں میں ہو۔ اگر یہ عنصر اپنی کوششوں میں کامیاب ہو گیا تو بائیں بازو کی صفوں میں بھٹکنے والے وہ مخلص کارکن جنہوں نے اپنی زندگیاں ایک اعلیٰ مقصد کے لئے وقف کر دی ہیں مزید الجھنوں میں گرفتار ہو جائیں گے۔

دوسری طرف نیپ ولی گروپ کے ذمہ دار ارکان بھی اپنی کمزوریوں کا جائزہ لے کر کوئی واضح لائحۂ عمل اختیار کرنے کی بجائے پیپلز پارٹی کے خلاف بیان بازی میں وقت ضائع کر رہے ہیں۔ نیپ ولی گروپ کے ان سیاستدانوں سے جن کا پیشہ ہی بورژوا سیاست ہے، ہمیں کوئی شکایت اس لئے نہیں کہ ان سے ہم کچھ اور توقع بھی نہیں رکھتے۔ لیکن ولی گروپ کا وہ عنصر جو سائنٹفک سوشلزم کا علمبردار ہے ابھی تک کوئی واضح لائحۂ عمل مرتب نہیں کر سکا۔ ہمیں امید ہے کہ ہر دو گروپ کے مخلص کارکن اپنے رہنماؤں کو حالات کے تقاضوں کے مطابق ایک نیا اور جاندار پروگرام اور طریقہ کار طے کرنے پر مجبور کریں گے۔ اور پیپلز پارٹی پر اپنے غیر ذمہ دار رہنماؤں کی جانب سے منفی انداز میں کی جانیوالی تنقید کو بند کرانے کی کوشش کریں گے۔ کیونکہ اس غیر ذمہ دارانہ تنقید سے موجودہ حالات میں صرف دائیں بازو کی رجعت پسند جماعتوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے انقلابی جدوجہد کو ان بے سروپا بیان بازیوں سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس کے برعکس پیپلز پارٹی میں آنے والا وہ نوجوان طبقہ جو انقلابی جدوجہد کے لئے آئندہ بہت بڑا سرمایہ ثابت ہو سکتا ہے، اس بے سروپا اور بے موقعہ تنقید سے بدظنی اور ذہنی انتشار کا شکار ہو جائے گا۔

ہندوستانی پارلیمنٹ کے انتخابات وقت سے پہلے کیوں؟



کیا اندرا گاندھی ترقی پسند نعروں کی مدد سے واپس آنا چاہتی ہیں؟

پچھلے ماہ ہندوستان کے صدر مسٹر وی وی گری نے ہندوستانی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے مشورے پر پارلیمنٹ توڑ کر نئے انتخابات کرانے کا اعلان کیا ہے جو اس سال مارچ میں ہوں گے پچھلے عام انتخابات کے بعد ہندوستان کی حکمراں پارٹی کانگریس جس پھوٹ اور انتشار کا شکار ہو گئی ہے اسکے نتیجے میں کانگریس دو ٹکڑوں میں بٹ گئی ہے جو نئی دلی اور پرانی دلی کی طرح نئی کانگریس اور پرانی کانگریس کے نام سے موسوم ہے۔!

پنڈت نہرو کی زندگی تک ان کی اپنی شخصیت کانگریس کو ایک مضبوط سیاسی پارٹی کی حیثیت سے باقی رکھنے میں معاون رہی لیکن پنڈت جی کی زندگی کے آخری دنوں ہی میں ان کے خلاف بغاوت کے آثار ظاہر ہو چکے تھے۔ کانگریس کی سابق اور موجودہ قیادت اگرچہ ایک سوشلسٹ سماج قائم کرنے کی داعی رہی ہے لیکن کانگریس پر ہندوستان کے اجارہ دار سرمایہ دار طبقے کا گہرا اثر رہا ہے جس کے نتیجے میں کانگریس کا رول ملکی پیمانے پر عوام دشمن اور بین الاقوامی طور پر بالعموم سامراج نواز رہا ہے۔!

ہندوستان میں استحصالی سرمایہ دارانہ معیشت کی وجہ سے عوام روز بروز معاشی بدحالی کے دلدل میں دھنستے چلے جا رہے ہیں۔ طبقاتی لوٹ کھسوٹ کے نتیجے میں طبقاتی نفرت بھی تیز سے تیز تر ہوتی چلی جا رہی ہے اور عوام اب کانگریسی اقتدار سے نجات حاصل کرنے کے لئے بیتاب ہیں اگرچہ پچھلے عام انتخابات میں کئی صوبوں کے اندر کانگریس کو شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن ساز باز اور سودے بازی کے ذریعہ کانگریس نے حکومت بنانے میں کامیابی حاصل کر لی البتہ اسمبلی میں واضح اکثریت میں نہ ہونے کی وجہ سے ہر وقت کانگریس کے لئے شکست کا خطرہ لاحق رہا۔

پچھلے دنوں اتر پردیش اور بہار میں کانگریسی حکومتوں کی ناکامی اور سابق والیانِ ریاست کے الاؤنس ختم کرانے میں ناکامی کے بعد مسز اندرا گاندھی کی حکمراں جماعت انڈین نیشنل کانگریس کا مستقبل بہت غیر یقینی ہو کر رہ گیا ہے۔ کانگریس پارٹی اپنے جماعتی مفادات کی وجہ سے اور عوام کو اپنے ترقی پسند ہونے کا یقین دلانے کے لئے دائیں بازو کی سیاسی جماعتوں کے مقابلے بائیں بازو کے اعتدال پسند عناصر کا تعاون حاصل کرتی رہی ہے۔ کانگریس پارٹی کے اس رویہ سے پرانی کانگریسی قیادت آنے والے انتخابات میں دائیں بازو کی دوسری سیاسی پارٹیوں کے ساتھ متحدہ محاذ بنانے کے لئے کوشاں تھی ان حالات میں مسز اندرا گاندھی مقررہ وقت سے تقریباً ایک سال پہلے انتخابات کروا کر اور دائیں بازو میں انتشار پھیلا کر اپنی جماعتی پوزیشن مضبوط کرنا چاہتی ہیں۔!

مسز گاندھی کا یہ اقدام صرف اپنی جماعتی پوزیشن مضبوط بنانے اور ان صوبوں میں جہاں کانگریس برسرِ اقتدار نہیں کانگریسی حکومت قائم کرنے کی ایک کوشش ہے اس کی تصدیق اس بات سے بھی ہو جاتی ہے کہ مسز اندرا گاندھی نے صرف ان صوبوں کو ازسرِ نو انتخابات کرانے کا مشورہ دیا ہے جہاں کانگریس برسرِ اقتدار نہیں لیکن ان صوبوں میں جہاں کانگریسی حکومتیں برسرِ اقتدار ہیں انہوں نے انتخابات نہ کرانے کا واضح اعلان کیا ہے۔!

ہندوستانی حکومت اپنی سامراج نواز اور محافظ سرمایہ دار پالیسیوں کی وجہ سے اپنے اندرونی مسائل میں بری طرح الجھی ہوئی ہے سارے ملک میں معاشی بدحالی کی وجہ سے ایک عام بے چینی پھیلی ہوئی ہے خصوصاً مغربی بنگال تو طبقاتی کشمکش کے شعلوں میں گھرا ہوا ہے، ناگا قبائل مرکزی حکومت کے لئے الگ دردِ سر بنے ہوئے ہیں، زمینوں پر قبضہ کرنے کی مہم کسانوں میں مقبول ہو رہی ہے، کشمیری عوام اپنے حقِ خود ارادی کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ یہ ایسے مسائل ہیں جن سے نمٹنا مسز اندرا گاندھی کی جماعت کے بس کا روگ نہیں، عام طور پر ہندوستانی حکمراں اپنے عوام کی توجہ ان کے حقیقی مسائل سے ہٹانے کے لئے پڑوسی ملکوں سے چھیڑ چھاڑ اور فرقہ وارانہ فسادات کا سہارا لیتے آئے ہیں، لیکن عوام حکمرانوں کے ان ہتھکنڈوں سے واقف ہوتے جا رہے ہیں۔ غالباً مسز اندرا گاندھی نے اس بار حکومت توڑنے کا ایک نیا چکر چلایا ہے جس کا مقصد ایک طرف عوام کی توجہ ان کے مسائل سے ہٹانا دوسری طرف ترقی پسندانہ نعروں کے سہارے دوبارہ کانگریس کو ایک مضبوط پارٹی کی حیثیت سے عوام کے سروں پر مسلط کرنا ہے۔ لیکن بھارت کے حالات اور کانگریس کی ۲۳ سالہ "خدمات" کے پیشِ نظر مسز اندرا گاندھی کی کامیابی مشکل نظر آتی ہے۔!

اریٹریا میں ظلم کا سیاہ دور

حریت پسند اقوام سے محاذ آزادی کی اپیل

اریٹریا کے محاذ آزادی نے عراق، لیبیا اور شام سے اپیل کی ہے کہ وہ ان کی آزادی کے مسئلہ کو سلامتی کونسل میں اٹھائیں۔

پچھلے چند ہفتوں کے دوران میں حبشہ کی سامراج نواز حکومت نے اریٹریا کی جنگ آزادی کی بڑھتی ہوئی لہر کو روکنے کے لئے تشدد کی کارروائیوں میں اضافہ کر دیا ہے۔ شہری آبادیوں پر اندھا دھند بمباری بھی کی گئی ہے، اور بے گناہ لوگوں کو شک کی بنا پر گرفتار کیا جا رہا ہے۔ ابتک اریٹریا کے تقریباً ۳۷ ہزار عوام ہیل سلاسی کے مظالم سے تنگ آکر سوڈان اور دوسری عرب ریاستوں میں پناہ لے چکے ہیں۔ محاذ آزادی کے مطابق حبشہ کی ظالمانہ کارروائی کے نتیجے میں اریٹریا کے صرف دو علاقوں میں پچھلے دنوں ایک ہزار سے زیادہ "بچے"، عورتیں اور بوڑھے ہلاک ہو چکے ہیں۔ محاذ آزادی نے دنیا کے تمام آزادی پسند ملکوں سے اپیل کی ہے کہ وہ اریٹریا کے عوام کے موقف کی حمایت کے ساتھ ساتھ خوراک، ادویات اور کپڑوں کے ذریعے انکی مدد کریں۔

اریٹریا میں جنگ آزادی جس رفتار سے پھیلتی جا رہی ہے امریکی سامراج کو حبشہ میں اپنے مفادات خطرے میں نظر آرہے ہیں، محاذ آزادی کے اعلان کے مطابق

حریت پسندوں کے خلاف شاہ ہیل سلاسی کی کارروائیوں میں امریکی فوجیں بھی حبشہ کی فوجوں کی مدد کر رہی ہیں۔ یہ صورتِ حال اس لئے سنگین ہے کہ امریکہ کی براہِ راست مداخلت اس علاقے میں شدید خون خرابے کا باعث بن جائے گی۔ لڑائی کی شدت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ حریت پسندوں کی فوجی کارروائیوں سے گھبرا کر حبشہ کی حکومت نے "اسمارا" کا ہوائی اڈہ بند کر دیا ہے اور جنگ کی خبریں شائع کرنے پر پابندی لگادی ہے۔ غیر ملکی صحافیوں کا اریٹریا میں داخلہ بند کر دیا گیا ہے!

حبشہ کی حکومت نے اریٹریا کے عوام کی جدوجہد آزادی سے دُنیا کے عوام کو بے خبر رکھنے کے لئے ایک طویل عرصے تک مغربی پریس کے تعاون سے عوامی جدوجہد کو چھُپانے کی کوشش کی لیکن حریت پسندوں نے اریٹریا کے مسئلہ سے دُنیا کے عوام کو روشناس کرانے کے لئے دشمن کے ہوائی جہازوں پر غیر ملکوں میں حملے کرنے کا آغاز کیا۔

کراچی کے ہوائی اڈہ پر بھی اریٹریا کے تین مجاہدین علی بن عبداللہ، محمد ادریس اور فضاحی نے ماہ جون ۱۹۶۹ء میں حبشہ کے ایک مسافر طیارے پر حملہ کیا تھا جس کے نتیجے میں سارے عالم اسلام کو اس مسئلہ کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ ان تینوں مجاہدوں کی قید کے دوران محاذِ آزادی کی سُپریم کمان کے ایک رکن عثمان ادریس نے پاکستان کے مختلف شہروں میں جلسوں وغیرہ کے ذریعہ اریٹریا کے عوام کی منصفانہ جدوجہد سے پاکستانی عوام کو روشناس کرانے کی کوشش کی تھی۔ عثمان ادریس نے اپنے موقف کی وضاحت کے لئے صدر مملکت سے بھی ملنے کی کوشش کی لیکن پاکستان کی اپنی سیاسی مصلحتوں اور بین الاقوامی تعلقات کی پیچیدگیوں کی وجہ سے صدر سے ملاقات کرنے میں انہیں ناکامی ہوئی۔

حال ہی میں اسلامی ملکوں کی کانفرنس کے دوران جہاں مسئلہ کشمیر بین الاقوامی مصلحتوں کی وجہ اسلامی کانفرنس کے ایجنڈے پر نہ آسکا وہیں اریٹریا کا مسئلہ بھی انہیں مصلحتوں کی نذر ہوگیا۔ بعض حلقوں میں اس اسلامی کانفرنس کے بارے میں بجا طور پر یہ سوال کیا جا رہا ہے کہ اسلامی کانفرنس جب دُنیا کے مسلمانوں کے اہم ترین مسائل مشرق وسطیٰ، کشمیر اور اریٹریا پر بھی کوئی مثبت اقدام کرنے اور ان مسائل کو محض برائے بحث ایجنڈے میں شامل کرنے سے معذور ہے تو پھر ایسی اپاہج کانفرنس کا نام اسلامی ملکوں کی کانفرنس رکھنا صریح خود فریبی اور سامراجی مقاصد کی تقویت کے سوا اور کیا ہے؟

(باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ کیجیے)

برطانوی دولتِ مشترکہ نے ۹۰ کروڑ انسانوں کو لپیٹ رکھا ہے

دولتِ مشترکہ کی، ادیب کانفرنس جو ۱۴ جنوری سے سنگا پور میں شروع ہو رہی ہے۔ برطانیہ کی طرف سے جنوبی افریقہ کو ہتھیاروں کی سپلائی کے مسئلہ پر ہنگامہ کا امکان۔

۳۱ قومیں ——— ۹۰ کروڑ افراد

دولتِ مشترکہ کے ارکان ممالک اور ان کے رہنما

ملک	آبادی	نمائندہ
آسٹریا	ایک کروڑ بیس لاکھ	جان گورٹن ۔ پی۔ ایم
باربراڈوس	دو لاکھ پچاس ہزار	ارل بارو ۔ پی ایم
بسوانہ	پانچ لاکھ پینتالیس ہزار	سر سیرٹ لکامہ ۔ صدر
کینیڈا	دو کروڑ دس لاکھ	پانیر ٹروڈیو ۔ پی ایم
سیلون	ایک کروڑ بیس لاکھ	مسز سریما بندرانائیکے ۔ پی ایم
فجی	پانچ لاکھ	راتو سر مارا پی ایم
قبرص	چھ لاکھ	آرچ بشپ میکاریوس ۔ صدر
گمبیا	تین لاکھ بیس ہزار	سر دادا جاورا ۔ صدر
گھانا	اسی لاکھ	کوفی بسیا ۔ پی ایم
گنی	سات لاکھ پچاس ہزار	فارس بہام ۔ پی ایم
ہندوستان	پچپن کروڑ	مسز اندرا گاندھی ۔ پی ایم
جمیکا	بیس لاکھ	ہیف شیرر پی ایم
کینیا	ایک کروڑ	جومو کنیاٹا ۔ صدر
لیسوتھو	دس لاکھ	چیف لیبوا جوناتھن ۔ پی ایم
ملاوی	چالیس لاکھ	ہسٹنگس بندھا ۔ صدر
ملائشیا	ایک کروڑ پانچ لاکھ	تن عبدالرزاق ۔ پی ایم
مالٹا	تین لاکھ بیس ہزار	پواگ اولیور ۔ پی ایم
ماریشا	۸ لاکھ	سر سیوو ساگر رامگولم ۔ پی ایم
نیوزی لینڈ	۲۸ لاکھ	سر کیتھ ہولیوک ۔ پی ایم
نائیجیریا	۶ کروڑ	میجر جنرل یعقوبو گوان سربراہ وفاقی فوجی حکومت
پاکستان	بارہ کروڑ ۵۰ لاکھ	جنرل یحییٰ خاں ۔ صدر
سیرالیون	۲۵ لاکھ	سیاکا اسٹیونس ۔ پی ایم
سنگاپور	۲۰ لاکھ	لی کان ای ۔ پی ایم
سوازی لینڈ	۴ لاکھ	پرنس مکھوسنی ولانی ۔ پی ایم
تنزانیہ	ایک کروڑ ۲۵ لاکھ	جولیس نیرر ۔ صدر
ٹونگا	اسی ہزار	پرنس ٹواپیلیہاک ۔ پی ایم
ٹرینیڈاڈ اور ٹوباگو	دس لاکھ	ارک ولیمس ۔ پی ایم
یوگینڈا	اسی لاکھ	ملٹن اوبٹس ۔ صدر
برطانیہ	پانچ کروڑ ساٹھ لاکھ	ایڈورڈ ہیتھ ۔ پی ایم
مغربی ساموا	ایک لاکھ تیس ہزار	ٹوپو تماس لیلوفی چہارم ۔ پی ایم
زمبیا	۴۰ لاکھ	کینتھ کاونڈا ۔ صدر

خصوصی رکن نورو پوپ چھ ہزار ۔ صدر ہومر ڈی روبرٹ ۔

گلگت اور بلتستان کو پاکستان کا ایک صوبہ بنایا جائے

نعیم آروی

سات لاکھ باشندے بالغ رائے دہی کے تحت اپنی اسمبلی کے ارکان خود منتخب کیوں نہ کریں؟



نگر کا ایک بازار

۷ اور ۱۷ دسمبر کو پاکستانی قوم بالغ رائے دہی کی بنیاد پر پہلی بار ایک تاریخ ساز مرحلے سے کامیابی کے ساتھ گذری عوام نے ۲۳ سالہ سیاسی اور معاشی گھٹن سے نکل کر اپنے پختہ سیاسی شعور کے ذریعہ مستقبل کے پروگرام کی نشاندہی کر دی لیکن اس تاریخ ساز فیصلے کے انبار میں کچھ لوگوں کو محروم کر دیا بھی ہوئی ہیں جنہیں انتخابات میں شامل نہیں کیا گیا۔ اگر ایسا ہوتا کہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں ہنزہ نگر، گلگت اور بلتستان کے عوام کو بھی شامل کر لیا جاتا تو شاید عوام کی خوشی دو چند ہو جاتی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ عام انتخابات میں جہاں پوری قوم کو اپنے نمائندے منتخب کرنے کا موقع دیا گیا۔ وہاں گلگت اور بلتستان کے قبائلی عوام کو آزادانہ طور پر اپنے نمائندے منتخب کرنے کا موقع فراہم نہیں کیا گیا بلکہ نام نہاد مشاورتی کونسل کے تحت محدود پیمانے پر انتخابات کرائے گئے اصولی بات تو یہ تھی کہ ان علاقوں میں بھی انہی قوانین اور ضابطے کے تحت انتخابات کرائے جاتے جن کی بنیاد پر پورے پاکستان میں انتخابات کرائے گئے۔ کیونکہ گلگت بلتستان، ہنزہ نگر، اشکومان، دریل تانگیر اور یاسین کے عوام بھی ہمارے بھائی ہیں اور انہیں بھی وہ تمام سیاسی اور معاشی حقوق ملنے چاہئیں جو ہمیں حاصل ہیں، لیکن ایسا نہیں ہوا

جمہوری حقوق

گلگت اور بلتستان کے عوام کو آج تک اس بات کا حق نہیں ملا کہ وہ آزادی کے ساتھ اپنے نمائندے منتخب کر سکیں نہ انہیں وہ جمہوری حقوق حاصل ہیں جو پاکستانی قوم کو حاصل ہیں، شائد اس کی وجہ یہ ہو کہ نقشوں میں ابھی تک شمالی سرحدوں کو ریاست جموں و کشمیر میں شامل دکھایا جاتا ہے۔ لیکن کاغذی نقشوں کی یہ شہادت عوام کے فیصلے کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ اور نہ ہی یہ چھپے چھپائے نقشے عوام کی قسمت کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ گلگت اور بلتستان کے عوام نے ایک بار نہیں سینکڑوں بار واشگاف الفاظ میں اعلان کیا ہے کہ وہ پاکستان کا حصہ ہیں انہیں وہ تمام حقوق اور مراعات دیئے جائیں جو پاکستان کے دیگر علاقوں کے عوام کو دیئے جاتے ہیں۔ نگران علاقوں کے سلسلے میں ہماری پالیسی میں ذرہ برابر بھی تبدیلی نہ ہوئی اور ابھی تک اس پر احتیاط اور دور اندیشی کے پردے پڑے ہوئے ہیں کہ اگر ہم نے مذکورہ علاقوں کے عوام کو سیاسی حقوق دیئے تو وہ اقوام متحدہ کے فیصلے کے مطابق ریاست جموں و کشمیر کی رائے شماری میں حصہ نہ لے سکیں گے۔

ہماری پالیسی یقیناً اس دور کے لئے صحیح تھی جب ایک مختصر مدت کے لئے ریاست جموں و کشمیر کا مستقبل تابناک

نظر آتا تھا۔ اور ہم یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ کشمیری عوام کو بہت جلد اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق مل جائے گا۔ لیکن سالہا سال کے تجربات نے ثابت کر دیا کہ ہماری امیدیں خوش فہمی پر مبنی تھیں۔ امریکی سامراج اور ہندوستانی حکومت کے عزائم کشمیر کے تصفیے کی راہ میں ہمیشہ ہاڑ بنے رہے۔ اس دلیل کے ساتھ کہ ریاست نے اکتوبر ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کے ساتھ الحاق کر لیا اور اب جموں و کشمیر ہندوستان کے "اٹوٹ انگ" ہیں کانگریسی حکومت نے ریاست میں آزاد اور منصفانہ رائے شماری کے فیصلے کو ٹھکرا دیا۔

یہ علاقہ کشمیر کے ماتحت نہ تھا

ریاست جموں و کشمیر کی تاریخ سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ شمالی سرحدیں کبھی بھی ریاست جموں و کشمیر کا حصہ نہیں تھیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ ان پر مہاراجوں کا تسلط رہا مگر اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ وہ کلی طور پر ریاست میں شامل تھیں، معاہدہ امرتسر کے بعد ریاست جموں و کشمیر پر گلاب سنگھ کی عملداری قائم ہوئی لیکن ۱۸۴۶ء تک شمالی حصے آزاد رہیں، ۱۸۴۶ء کے بعد کشمیری فوج ان علاقوں پر لگاتار حملے کرتی رہی لیکن وہ مکمل طور پر ان علاقوں کو کبھی مغلوب نہ کر سکی۔ چنانچہ بعد میں کچھ معاہدے بھی ہوئے جس کے مطابق رسمی طور پر سرینگر سے تعلقات قائم ہوئے۔ اگر ان رسمی تعلقات کا مطلب یہ نکال لیا جائے کہ شمالی سرحدیں ریاست میں شامل تھیں تو یہ تاریخ کا بدترین جھوٹ ہوگا۔

یہ بات کسی حد تک صحیح ہے کہ کشمیر کی حکومت نے شمالی سرحدوں کو ریاست میں شامل کرنے کے لئے کئی بار برطانیہ سے اجازت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ کوشش بار آور ثابت نہ ہوئی۔ ۱۹۴۰ء میں برطانوی حکومت نے اعلان کیا کہ شمالی سرحد کے علاقے ایک آزاد اور علیحدہ ریاست کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انہیں معاہدہ امرتسر کے مطابق ریاست میں ہرگز شامل نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ایسا کیا گیا تو معاہدہ امرتسر کی خلاف ورزی ہوگی۔ برصغیر کی برطانوی حکومت کے اس اعلان سے شمالی سرحدوں کی قانونی اور سیاسی پوزیشن کے بارے میں ہر قسم کے شکوک و شبہات ختم ہو جاتے ہیں اور یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ شمالی سرحدی علاقے ریاست جموں و کشمیر میں کبھی شامل نہ تھے۔

۱۹۴۷ء سے ان علاقوں کے عوام نے عملی طور پر ثابت کیا ہے کہ وہ ہندوستان کے ساتھ نہیں بلکہ وہ ذہنی و جسمانی طور پر پاکستان کے ہمرکاب ہیں۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ جب کبھی رائے شماری کا موقع آیا وہ اپنا فیصلہ پاکستان کے حق میں دیں گے۔ لہٰذا ہندوستانی حکومت اس بات میں زیادہ دلچسپی لے گی کہ رائے شماری کے وقت اس علاقے کے عوام کے ووٹ شامل نہ کئے جائیں۔ شاید ایسے کسی موقع پر ہندوستان یہ سوال اٹھانے سے بھی گریز نہیں کرے گا کہ رائے شماری میں شامل علاقوں میں سے شمالی سرحدوں کو علیحدہ کر دیا جائے۔

ان حقائق کی روشنی میں مذکورہ شمالی سرحدی علاقوں کے عوام کو اپنا جمہوری حق استعمال کرنے کا موقع فراہم کرنا عین قرین مصلحت ہوگا۔ اس اقدام سے رائے شماری میں کوئی رکاوٹ یا پیچیدگی پیدا نہ ہوگی۔ بلکہ اس سے کشمیری عوام کے حق خودارادیت کے موقف کو فائدہ پہنچنے کا زیادہ امکان ہے۔

موجودہ صورت حال میں ہندوستانی حکومت کو یہ پروپیگنڈہ کرنے کا موقع مل جاتا ہے کہ ان علاقوں کے عوام کو جو پاکستان کے ماتحت ہیں جمہوری حقوق اور مراعات حاصل نہیں۔ اگر ان علاقوں کے عوام کو جمہوری حقوق استعمال کرنے کا موقع دے دیا گیا تو ہندوستان کا سارا مذموم پروپیگنڈہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ مقبوضہ علاقے کے عوام کو یہ باور کرنے کا موقع ملے گا کہ پاکستان میں جمہوری قدروں کا تحفظ کیا جاتا ہے۔ کشمیری عوام کی حق خودارادیت کی جدوجہد اسی طور پر مضبوط کی جا سکتی ہے۔

شمالی علاقوں کے عوام کے جائز مطالبات پورے کرنے کے لئے تین باتیں ضروری ہیں، سب سے پہلے مذکورہ علاقوں کو پاکستان میں شامل کر کے انہیں ایک صوبے کی حیثیت دے دی جائے۔ اور تمام کاروبار و معاملات کو ایک صوبائی انتظامیہ کے سپرد کر دیا جائے۔ جس میں ایک ہائی کورٹ بھی شامل ہو۔

دوسرے مرحلے میں ریاستوں کو اس صوبے کے اندر مدغم کر دیا جائے جس طرح بعض ریاستوں کا الحاق مغربی پاکستان کے ساتھ ہوا تھا۔ تیسرے مرحلے میں اس نئے صوبے کے لئے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کی سیٹیں مقرر کر دی جائیں اور بالغ رائے دہی کی بنیاد پر براہ راست انتخابات کرائے جائیں۔

اریٹیریا کا اصل دشمن بھی امریکہ ہے (صفحہ ۲۳ سے آگے)

اریٹیریا کی نوآبادیاتی تاریخ جنوری ۱۸۹۰ء سے شروع ہوتی ہے جب اطالویوں نے اس پر قبضہ کر کے اسے اپنی نوآبادی بنا لیا۔ اس کے بعد اس صورت حال میں تبدیلی ۱۹۴۱ میں آئی جب اریٹیریا پر برطانیہ نے قبضہ کر لیا جو تقریباً دس سال باقی رہا۔ ۱۹۴۸ء اور ۱۹۵۲ء کے درمیان اریٹیریا کے عوام نے اپنی فوری اور غیر مشروط آزادی کا مطالبہ کیا لیکن عوام کی رائے کو نظرانداز کر کے اس مسئلہ کو اقوام متحدہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ چونکہ سامراجی ممالک اقوام متحدہ کو اپنے مقاصد کے سوا کسی اور غرض سے استعمال نہیں ہونے دیتے، لہٰذا امریکہ کی ایما پر جنرل اسمبلی نے دسمبر ۱۹۵۰ میں پیش کی ہوئی امریکی قرارداد کے مطابق اریٹیریا کو ایک قرارداد کے ذریعہ حبشہ کے ساتھ زبردستی نتھی کر دیا گیا۔

۱۹۴۱ء میں اطالویوں سے اریٹیریا کو چھین لینے کے بعد برطانیہ نے امریکہ سے وعدہ کیا کہ وہ امریکہ کو میرین ریڈیو اسٹیشن استعمال کرنے دے گا۔ اسی اسٹیشن کو بعد میں امریکہ کے سب سے بڑے وائرلیس اسٹیشن میں بدل کر اس کا نام کاگینو اسٹیشن رکھا گیا۔ یہ اسٹیشن پوری دنیا میں امریکہ کے دفاعی اور مواصلاتی رابطہ کا سب سے بڑا ذریعہ ہے جس کی تعمیر پر تقریباً ۶۰ ملین ڈالر خرچ کیا گیا ہے۔ اس طرح امریکی مفادات کی خاطر اریٹیریا کے اس مواصلاتی اسٹیشن کا حبشہ کے ذریعے امریکہ کے کنٹرول میں رہنا ضروری ہے۔ ادھر حبشہ کے پاس اریٹیریا کے بغیر سمندر تک پہنچنے کا اور کوئی راستہ نہیں۔ لہٰذا حبشہ اور امریکہ کے باہمی مفادات کو پورا کرنے کے لئے اریٹیریا کو قربانی کا بکرا بنا دیا گیا ہے۔

امریکہ کے لئے ایک اور بات زیادہ پریشانی کا سبب بنی ہوئی ہے وہ یہ کہ اریٹیریا کا محاذ آزادی ایک ایسی ترقی پسند قیادت کے تحت جنگ آزادی لڑ رہا ہے جو کٹر قسم کی سامراج دشمن بھی ہے۔ اریٹیریا کی آزادی کی صورت میں امریکہ کے مواصلاتی اسٹیشن کی تباہی لازمی ہے جسے امریکہ موجودہ حالات میں برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ اقتصادی اور فوجی امداد کے نام پر حبشہ کی مسلسل مدد کر رہا ہے۔ لیکن اریٹیریائی عوام کے جذبۂ آزادی کو نہ امریکی امداد ختم کر سکتی ہے نہ حبشہ کی فوجوں کی سفاکی بعض عرب ملکوں خصوصاً شام، عراق وغیرہ کے علاوہ ایشیائی عوام کی آزادی کا پاسبان چین بھی اریٹیریا کے عوام کی بھرپور مدد کر رہا ہے۔ عرب ملکوں میں حال میں جو تبدیلیاں آئی ہیں جن میں لیبیا اور سوڈان میں ترقی پسند اور سامراج دشمن عناصر کا برسراقتدار آنا شامل ہیں اس بات کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں کہ پہلے کے مقابلے میں اریٹیریا کی اب زیادہ بڑے پیمانے پر مدد کی جائے گی۔

پاکستان بھی کشمیر کے عوام کے حق خودارادی کے لئے مسلسل جدوجہد کر رہا ہے امید ہے کہ اریٹیریا کے عوام کے حق خودارادی کی غیر مشروط حمایت میں پاکستان سیاسی مصلحتوں کی پرواہ نہ کرے گا۔ عثمان ادریس کے قیام پاکستان کے دوران ملک کے تقریباً تمام حصوں کے عوام نے اریٹیریا کے عوام کی مکمل حمایت کر کے حکومت کے ہاتھ مضبوط کر دیئے ہیں اب حکومت کو چاہئے کہ اریٹیریا کے مسئلہ پر ایک واضح موقف اختیار کرے۔

ولی خاں نیپ کی تنظیم نو کے مشورے

سامراج کے خلاف کھل کر آواز بلند کی جائے گی

صفدر میر کی گرفتاری کے خلاف شدید ردّ عمل

نیشنل عوامی پارٹی (ولی گروپ) نے مرکزی اور صوبائی انتخابات میں اپنی توقعات کے مطابق نشستیں حاصل نہ کرنے پر پارٹی کی کمزوریوں کا جائزہ لینے اور اسے سوشلزم کے اصولوں پر منظم کرنے کا فیصلہ کیا ہے نیپ ایک باوقار پرانی سیاسی جماعت ہے اس کے رہنماؤں خان عبدالغفار خان، عبدالولی خان اور ان کے ساتھیوں نے نہ صرف برصغیر کی جنگ آزادی میں بھرپور حصہ لیا اور بے پناہ قربانیاں دیں بلکہ قیام پاکستان کے بعد بھی ان کی قومی خدمات سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ یہ پارٹی اب تک لکیر کی فقیر بنی رہی اور عبدالولی خان کی نوجوان قیادت بھی پارٹی کے پروگرام میں کوئی انقلابی تبدیلی نہ لا سکی یہی وجہ ہے کہ ملک کی یہ سب سے بڑی تنظیم مختلف حصوں میں بٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ اور انقلابی خیالات کے رہنما پارٹی میں اپنے نظریات کی گنجائش نہ پا کر اپنی الگ تنظیمیں قائم کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس سلسلہ میں افضل بنگش، محمود علی قصوری اور کئی ایک دوسرے روشن خیال رہنماؤں کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں جو اس پارٹی کے دل و دماغ کی حیثیت رکھتے تھے اگر اس وقت ان حضرات کے قیمتی مشوروں کو قبول کرتے ہوئے پارٹی کا منشور عوامی تقاضوں کے مطابق مرتب کیا جاتا تو شاید آج اس پارٹی کی پوزیشن اس قدر مایوس کن نہ ہوتی تاہم یہ بڑی خوشگوار بات ہے کہ پارٹی کے سربراہوں نے اس بات کو محسوس کر لیا ہے۔ یہ ایک حقیقت پسندانہ اور ترقی پسندانہ عمل ہے کہ اپنے اندر خود تنقیدی کا جذبہ پیدا کیا جائے اپنی فروگذاشتوں کا اعتراف کر لیا جائے اور ماضی کی غلطیوں کا اعادہ کرنے کے بجائے ان کا ازالہ کرنے کی کوشش کی جائے۔

نیپ کے ایک سرکردہ رہنما مولانا اسمٰعیل ذبیح نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے۔ نیپ کے سربراہ عبدالولی خان کو مشورہ دیا ہے کہ وہ امریکی سامراج کے خلاف کھل کر آواز بلند کریں اور سوشلزم کے اصولوں پر پارٹی کی تنظیم نو کرتے ہوئے زمینیں کسانوں میں تقسیم کرنے اور تمام بڑی صنعتوں کو قومی ملکیت میں لینے کا اعلان کریں اور قومی سالمیت کی خاطر مجیب اور بھٹو میں مفاہمت کرانے کے لئے مؤثر کردار ادا کریں انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ بلوچ اور پختون نیشنل ازم کو قومی سالمیت سے ہم آہنگ کیا جائے تاکہ اگر ان علاقوں میں کسی قسم کا تعصّب باقی ہے تو وہ دور ہو سکے۔

پشاور اور صوابی ہزارہ کی نشستوں کے ضمنی انتخابات کی سرگرمیاں پورے عروج پر پہنچ گئی ہیں پیپلز پارٹی کے رہنماؤں مولانا کوثر نیازی، خورشید حسن میر، جاوید حکیم قریشی، پرویز رشید، طارق عزیز اور معراج محمد کے طوفانی دوروں اور آتشیں تقریروں نے یہاں کی سیاسی فضا کو یکسر پلٹ دیا ہے اور پیپلز پارٹی کے امیدواروں کی کامیابی یقینی ہو گئی ہے ۱۰ جنوری کو یہاں پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو پشاور آ رہے ہیں وہ صوابی ہزارہ کے علاقے کا دورہ بھی کریں گے ان کے استقبال، جلوس اور جلسے کی تیاریاں شروع ہو چکی ہیں خیال ہے کہ بھٹو صاحب کے آنے سے پیپلز پارٹی کے حق میں فضا اور زیادہ سازگار ہو جائے گی۔

پشاور میں پاکستان مسلم لیگ کے امیدوار مسٹر یوسف خٹک نے اپنے ایک بیان میں ان لوگوں کی مذمت کی ہے جو شہری اور غیر شہری کا سوال پیدا کر کے عوام میں تعصّب پھیلا رہے ہیں، انہیں شاید معلوم نہیں کہ یہ سوال خود قیوم خان کا پیدا کردہ ہے اپنے انتخابات میں انہوں نے یہ تعصّب کی آگ بھڑکا کر فائدہ اٹھانے کی کوشش کی لیکن اب یہی چیز ان کے امیدوار کے خلاف جا رہی ہے کیونکہ وہ پشاور کا باشندہ نہیں بلکہ کوہاٹ سے تعلق رکھتا ہے ؎

قاتل خود اپنی تیغ کا صدقہ اُتر گیا

سرحد مزدور کسان پارٹی کے رہنما مسٹر افضل بنگش نے ضلع مردان میں پارٹی کے زیر اہتمام ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا صدر یحییٰ نے ون یونٹ کے خاتمے اور ریاستی ادغام اور عام انتخابات کے وعدے پورے کر دیے لیکن مزدوروں کسانوں کے مطالبات ابھی تک پورے نہیں کئے انہوں نے کہا عوام سوشلزم چاہتے ہیں۔ حالیہ انتخابات سے یہ بات واضح ہو چکی ہے انہوں نے مطالبہ کیا کہ صوبہ سرحد میں زمین کسانوں میں تقسیم کر دی جائے ورنہ ماہ جولائی میں کسان اور مزدور اپنی زمینوں اور کارخانوں پر خود قبضہ کر لیں گے۔

شمالی ہشتنگر میں یوں تو کھیت مزدوروں اور کسانوں پر خوانین کے مظالم کوئی نئی بات نہیں لیکن مزدور کسان تنظیم کی سرگرمیوں کے بعد اس علاقے کے جاگیرداروں نے منظّم طور پر کسانوں کو کچلنے کی مہم شروع کر دی ہے۔ اور جب ملکی انتخابات میں وہ اپنے مزارعین کے ووٹ حاصل کرنے میں ناکام رہے تو ان کے غیض و غضب کی کوئی انتہا نہیں رہی اور انہوں نے وسیع پیمانے پر مزارعین کو بے دخل کر کے ان کی تیار فصلوں اور گھروں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ یہ اندھا دھند بے دخلیاں اور مظالم جاگیرداروں کی طرف سے کسانوں میں خوف و ہراس پھیلانے کی ایک گہری سازش ہے۔ یہ کھیل مقامی پولیس کی ملی بھگت سے کھیلا جا رہا ہے۔ اگر حکومت نے صورت حال پر قابو پانے کی کوشش نہ کی تو اس کے خطرناک نتائج برآمد ہوں گے اور اس کی ذمہ داری یقیناً حکومت کے اہل کاروں پر ہو گی جو مزدور کسان رہنماؤں کے بار بار خبردار کرنے کے باوجود غریب کسانوں کا تحفّظ کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

پشاور یونیورسٹی اور کالجوں کے طلبا نے بھارت کے ایک یہودی مصنف کی کتاب کے خلاف احتجاجی جلوس نکالا اس کتاب میں جو برطانیہ میں چھپی ہے پیغمبر اسلام کی شان میں گستاخانہ الفاظ استعمال کئے گئے ہیں طلبا نے برطانوی محکمہ اطلاعات کی لائبریری ڈپٹی ہائی کمشنر کی رہائش گاہ اور امریکی دفتر اطلاعات کی لائبریری کے سامنے مظاہرہ کرتے ہوئے ان عمارتوں پر سنگباری کی اور سامراجی حکومتوں کیخلاف نعرے لگائے اس جلوس میں پشاور یونیورسٹی کے تمام شعبوں کے طلبا کے علاوہ گورنمنٹ کالج، ایڈورڈز کالج کینٹ پبلک کالج اور کمرشل کالج کے طلبا بھی شامل تھے، مردان اور نوشہرہ میں بھی طلبا نے احتجاجی جلوس نکالے نوشہرہ میں ایک شراب کی دکان پر پتھراؤ کیا گیا اور گورنمنٹ کالج نوشہرہ کے پانچ طالب علم رہنماؤں نے شوبرا چوک میں اس دلآزار کتاب کے خلاف چوبیس گھنٹوں کے لئے بھوک ہڑتال شروع کر دی ہے۔

پی پی ایل میں گرفتاریوں پر احتجاج

پی پی ایل ورکرز یونین کے صدر محمد صفدر میر مسٹر کاردار اور ان کے دوسرے ساتھیوں کی اس ادارہ کے ملازمین کی ناجائز برطرفی کے خلاف بھوک ہڑتال اور گرفتاریوں پر صوبہ سرحد کے طول و عرض میں دانشوروں، صحافیوں، ادیبوں اور طالب علم رہنماؤں نے گہری تشویش کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے برطرف صحافیوں کے مطالبات کی مکمل حمایت کرتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ جلد از جلد پریس ٹرسٹ توڑ کر تمام برطرف صحافیوں کو فوراً بحال کیا جائے ورنہ اس

خطے کے دانشور، صحافی، طلبا اور مزدور بھی ان کی حمایت میں بھوک ہڑتال کرنے پر مجبور ہوں گے۔ انہوں نے ایک دستخطی بیان میں جو تمام متعلقہ حکام کو بھیجا گیا حکومت کو متنبہ کیا ہے کہ اگر ہڑتالی رہنماؤں پر کوئی آنچ بھی آئی تو حالات قابو سے باہر ہو جائیں گے۔ وہ اس معاشی قتل کے خاموش تماشائی نہیں رہیں گے۔ اور استحصالی طبقے کو شکست دینے کے لئے وہ کچھ کر گزریں گے جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

پشاور کی ضلعی انتظامیہ نے گرانی کے ذمہ دار دکانداروں کے خلاف سخت کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس نے تاجروں اور دکانداروں کو خبردار کیا ہے کہ وہ مجرمانہ منافع خوری سے باز آجائیں ورنہ ان کے خلاف سخت اقدام کیا جائے گا۔ پیپلز پارٹی، نیپ اور جمعیت العلما (ہزاروی گروپ) کے رہنماؤں نے ملکی انتخابات کے فوراً بعد ہوشربا گرانی پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے اسے مل مالکان اور کارخانہ داروں کی گہری سازش کا نتیجہ قرار دیا ہے جس کا مقصد سرمایہ دارانہ نظام کو مسترد کرنے والے عوام کو سزا دینا اور ہراساں کرنا ہے۔

عوام کے قاتل کون ہیں ؟

حکومت نے بڑھتی ہوئی گرانی کو روکنے کے لئے اس سے پہلے بھی کئی دفعہ اس قسم کی مہم شروع کی لیکن یہ مہم غریب دکانداروں کے محاسبے تک محدود رہی اور ان عناصر کو کھلی چھٹی حاصل رہی جو اس شرانگیزی کے اصل ذمہ دار ہیں حالانکہ یہ واضح حقیقت ہے کہ چھوٹے دکانداروں کا اس مہنگائی سے کوئی تعلق نہیں وہ تو جس بھاؤ لاتے ہیں اسی بھاؤ فروخت کرنے پر مجبور ہیں۔ اس دھاندلی کے ذمہ دار تو وہ منافع خور سرمایہ دار اور ذخیرہ اندوز جو مارکیٹ کے اتار چڑھاؤ کے اجارہ دار ہیں۔ لیکن ان حریص کارخانہ داروں، مل مالکوں اور ذخیرہ اندوزوں کی عوام کش سازشوں کے آگے بند باندھنے کی کوئی کوشش اب تک نہیں کی گئی۔ یہ عناصر جو بناسپتی کی قیمت بڑھا کر عوامی احتجاج اور حکومت کی دھمکیوں پر تین روپے کم "کر کے حکومت اور عوام دونوں کو مرہون احسان کر رہے ہیں۔ جو آٹے کی قیمت سات روپے بوری اضافہ کر کے چار روپے کمی" کے اعلان سے حاتم کی قبر پر لات مارنے کا کارنامہ انجام دے رہے ہیں۔ ان سے حکومت نہیں پوچھتی کہ ملک میں کیا قیامت آئی ہے، کون سا قحط پڑا ہے، کون سے ہنگامی حالات پیدا ہوئے ہیں کہ وہ اس ظالمانہ گرانی پر مجبور ہوئے اور ۲۰ فیصد قیمت بڑھانے کے بعد ۱۰ فیصد کم کر کے انہوں نے کون سا تیر مارا ہے جس کی وہ داد کے بھی طالب ہیں۔ اور یہ سخاوت کا کون سا نسخہ ہے جس سے وہ غریب عوام کی گرتی ہوئی قوت خرید کا مداوا کرنا چاہتے ہیں۔ ہم حکومت کی نیک نیتی پر شبہ نہیں کرتے لیکن اس پر واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ جس طریق کار سے وہ اس گرانی کو روکنے کا ارادہ رکھتی ہے اس سے چند مظلوم معمولی دکانداروں کی حسب سابق قربانی کے سوا کوئی فائدہ نہ ہوگا ضرورت اس امر کی ہے کہ اصل قاتلوں کا کھوج لگا کر انہیں عبرتناک سزائیں دی جائیں کہ صرف اسی طرح اس کی روک تھام کی جا سکتی ہے۔

کیا جی ایم سید

عوامی لیگ کو عوامی

جماعت بنائیں گے ؟

سندھ میں اُبھرتی ہوئی ترقی پسند قوتوں کی کامیابی سے بدحواس ہو کر شر پسند عناصر فرقہ وارانہ فساد کرانے پر اُتر آئے ہیں جس کا مقصد پیپلز پارٹی کی متوقع حکومت کے قیام اور اُس کے سوشلسٹ پروگرام کو سبوتاژ کرنا ہے۔ اور حالیہ انتخابات میں عوامی فتح کے اثر کو زائل کرنا ہے۔

انتخابی شکست کو تسلیم کرنے کے بجائے شکست خوردہ سیاسی وڈیرے، غائب باش زمیندار اور نودولتیے صنعتکار جو محنت کش عوام کو لُوٹ کھسوٹ کر عیش کرتے رہے ہیں افسر شاہی کے درپردہ تعاون سے پیپلز پارٹی کے معاشی منصوبوں اور زرعی اصلاحات کو ناکام بنانے کے لئے نت نئے اسٹنٹ چلا رہے ہیں تاکہ عوام کی توجہ معاشی مسائل سے ہٹا کر گمراہ کُن نعروں اور فروعی ہنگاموں کے ذریعہ اپنی چودھراہٹ برقرار رکھی جا سکے۔

جی ایم سید، قاضی فیض محمد اور بعض دیگر شکست خوردہ عناصر نے مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ اور مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی کی زبردست فتح سے مایوس ہو کر پیپلز پارٹی کو زک پہنچانے اور خود کو سیاسی طور پر دوبارہ بحال کرنے کے لئے محض "بُغض معاویہ" میں عوامی لیگ کی نقالی شروع کر دی ہے اور اس کا مقصد عوامی نہیں بلکہ ذاتی اغراض کی تکمیل ہے۔ دریں حالات شیخ مجیب الرحمان کے نعروں اور نکات کو نئے سرے سے اپنا کر ان دنوں سندھ میں عوامی لیگ کو پیپلز پارٹی کے متوازی جماعت بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس ضمن میں سنجیدگی کے ساتھ عوامی لیگ کی تنظیم نو کرنے کے بجائے جذباتی انداز میں پیپلز پارٹی اور اس کی قیادت پر حملے کئے جا رہے ہیں۔ شاید اس طرح بعض عصبیت زدہ اور موقع پرست سیاسی مہم جو عوام کے ووٹ کے بجائے شیخ مجیب الرحمان کے دُم چھلے بن کر اور عوام کا اعتماد حاصل کرنے کا صبر آزما ہفت خواں طے کرنے کے بجائے بانس کی سیڑھی پر چڑھ کر اپنا سیاسی قد و قامت اونچا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اس بات کے لئے بھی کوشاں ہیں کہ عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی میں کسی قسم کی مفاہمت نہ ہو سکے اور یہ جماعتیں ایک دوسرے کے تعاون سے سماجی و معاشی فلاح و بہبود کے منصوبوں کو عملی جامہ نہ پہنا سکیں۔ اُن کے خیال میں مشرقی پاکستان میں زمیندار اور جاگیردار طبقہ کا وجود نہ ہونے کے سبب سے عوامی لیگ کے پروگرام میں انقلابی زرعی اصلاحات شامل نہیں۔

یہاں سیاسی مبصّروں کا کہنا ہے کہ سندھ میں عوامی لیگ کو کاغذی جماعت کے بجائے حقیقی جماعت بنانے کا فیصلہ کرنے میں جی ایم سیّد اور اُن کے حواری بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ اگر وہ الیکشن سے پہلے اپنی مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر عوامی لیگ کا قیام عمل میں لاتے تو شاید اُس وقت یہ نُسخہ کچھ کارگر ہوتا لیکن اب حالات بدل چکے ہیں۔ سندھ اور مغربی پاکستان کے مخصوص حالات اور گریز پا سیاسی واقعات کے پیش نظر چھ نکات کا معجون جی ایم سیّد کی سیاسی کمزوری دُور نہیں کر سکتا۔

باخبر ذرائع کے مطابق نواب شاہ سے سندھ اسمبلی کے آزاد ممبر سیّد ظفر علی شاہ آزاد ممبر سید نذر شاہ، علی نواز اُنہڑ سکھر سے صوبائی اسمبلی کے منتخب آزاد ممبر رحیم بخش سومرو اور بعض دیگر ارکان کو عوامی لیگ میں شمولیت کی ترغیب دی جا رہی ہے۔ واضح رہے کہ مذکورہ بالا حضرات میں سے بیشتر کا تعلق نوابشاہ کے سیّد گروپ سے ہے جو جی ایم سیّد کی حمایت اور ذوالفقار علی بھٹّو کی مخالفت کے لئے معروف ہیں۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ گزشتہ سال جب شیخ مجیب الرحمٰن مغربی پاکستان آئے تھے تو جی ایم سیّد نے انہی سیاسی وڈیروں کے تعاون سے ضلع نواب شاہ میں عوامی لیگ کے سربراہ کے جلسہ، جلوس اور دورے کا اہتمام کیا تھا۔ اگر جی ایم سیّد کی ساز باز سے سندھ اسمبلی کے چند آزاد ممبروں نے عوامی لیگ میں شمولیت اختیار کر لی تو غالباً پارلیمانی تاریخ کا یہ عجوبہ ہوگا کہ کوئی پارٹی ایک صوبے کے انتخابات میں تو کامیاب نہ ہو لیکن اسمبلی کے اندر معرضِ وجود میں آجائے۔ پارٹی کے ٹکٹ پر کھڑے ہونے والے اُمیدوار تو ہار جائیں لیکن کامیاب ہونے والے بعض آزاد ممبروں کی شمولیت سے ایک پارلیمانی پارٹی بن جائے۔ یہاں یہ بات بھی معنی خیز ہے کہ کل پاکستان عوامی لیگ کے نائب صدر اور نوابشاہ برائے قومی نشست کے ناکام اُمیدوار قاضی فیض محمد نے انتخابی مہم کے دوران میں تو جی ایم سیّد پر کڑی نکتہ چینی کی لیکن انتخابی مہم سے فارغ ہوتے ہی انھوں نے مسٹر بھٹّو پر سخت تنقید کرتے ہوئے پیپلز پارٹی کے خلاف سیاسی مہم چلا رکھی ہے۔

عوامی لیگ کی نئی طاقت ؟

سندھی ادبی سنگت کے بعض شاعر اور ادیب جن میں شیخ ایاز اور رشید بھٹّی کے نام سرفہرست ہیں چھ نکات کی حمایت میں بیان دے کر عوامی لیگ میں شمولیت کا اعلان کر چکے ہیں۔ سکّھر کے معروف سیاسی ورکر فتح اللہ عثمانی اور نبی بخش کھوسو بھی عوامی لیگ کے ضلعی کنوینر اور کارکن بن چکے ہیں۔ جیئے سندھ نوجوان محاذ اور جیئے سندھ سٹوڈنٹس فیڈریشن میں شامل طلبا بھی صوبائی خودمختاری کے ساز پر عوامی لیگ کا

حیدر آباد سے ایک خط : احمد اسطاف

راگ الاپنے لگے ہیں، جبکہ مکمل صوبائی خودمختاری کا حصول پیپلز پارٹی اور نیپ کے منشور کا بھی لازمی جزو ہے۔

سندھ متحدہ محاذ آجکل اس پروپیگنڈہ میں مصروف ہے کہ ایک طرف ون یونٹ ٹوٹا ہے تو دوسری طرف مغربی پاکستان میں زونل فیڈریشن کا قیام عمل میں لایا جانے والا ہے۔ اس طرح بھی سندھ کے عوام کو پیپلز پارٹی سے بدگمان کرنے کے لئے سازش ہو رہی ہے۔ جی ایم سید کے ڈھنڈورچی بے وقت اور بلا وجہ یہ الارم بجا رہے ہیں کہ "پیپلز پارٹی میں شامل اور پارٹی کے وائس چیئرمین کے منصب پر متمکن ہو کر محمود علی قصوری نے جو دولتانہ کے بعد پنجاب کے مفادات کے محافظ تصور کئے جاتے ہیں دور اندیشی سے کام لیا ہے اور سابق نوجیوں اور بیوروکریسی کے ایک مقتدر گروپ کے ایما پر سندھ میں اُن کے مفادات کا تحفظ کر لیا ہے اور مغربی پاکستان میں بعض اہم شعبوں میں بین الصوبائی ادارے قائم کر کے زونل فیڈریشن کا منصوبہ بنایا ہے"۔ واضح رہے کہ گزشتہ دنوں کراچی میں جی ایم سید کی قیام گاہ پر سندھ متحدہ محاذ کا ایک جلاس ہوا جس میں انہوں نے اپنے ذہن کے پیدا کردہ زونل فیڈریشن کی مخالفت میں قرارداد منظور کی جبکہ پیپلز پارٹی کے چیئرمین جناب ذوالفقار علی بھٹو زونل فیڈریشن کے بارے میں پہلے ہی واضح تردید کر چکے ہیں کہ ایسی کوئی تجویز زیرِ غور نہیں۔

جی ایم سید کے قریبی حلقوں نے انکشاف ہے کہ یوسف ہارون کی وساطت سے کراچی کے بعض اجارہ دار سرمایہ داروں سے بھی مراسم استوار کر رہے ہیں۔ جس کا مقصد ایک تیر سے دو شکار کرنا ہے۔ اول یہ کہ بڑے سرمایہ داروں سے گٹھ جوڑ کر کے پیپلز پارٹی کی متوقع حکومت کو ناکام کرایا جائے۔ دوم اردو اور گجراتی تفضیر جنم دے کر عوام کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکایا جائے۔ اس طرح سید صاحب سندھ نیپ کو سبوتاژ کرنے کے بعد اب پیپلز پارٹی کی مقبولیت کو نقصان پہنچانے کے درپے ہیں۔ لیکن ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی تاریخ کا دھارا ان کے خلاف جا رہا ہے۔ عوام اتنے باشعور ہو چکے ہیں کہ وہ ان کے بچھائے ہوئے جال میں پھنسنے کے لئے تیار نہیں جس کا بخوبی اندازہ انہیں انتخابات میں بھی ہو گیا ہوگا۔

نئے سندھیوں کے خدائی فوجدار نواب مظفر حسین کے پیٹ میں انتخابات کے بعد اسلام پسندی کے بجائے اردو کا درد اُٹھا ہے۔ اب وہ فرسودہ نعرے کے بجائے اردو محاذ بنا کر نئے روپ میں نمودار ہوئے ہیں لطف کی بات یہ ہے کہ وہ مخالف محاذ کے صدر جی ایم سید کے بجائے پیپلز پارٹی کے چیئرمین کو ہدف بنا رہے ہیں۔ انہوں نے گذشتہ دنوں بیان دیا کہ پیپلز پارٹی کے سربراہ ذوالفقار علی بھٹو اور سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر غلام مصطفےٰ شاہ کے مابین لسانی مسئلہ پر ایک معاہدہ ہوا ہے جب کہ ایک دنیا جانتی ہے کہ غلام مصطفےٰ شاہ، بھٹو کے مخالف اور جی ایم سید کے ہمنوا ہیں۔ ۸ اور ۹ دسمبر کے اخبارات میں شائع شدہ خبر کے مطابق این ڈبلیو ۱۲۵ (دادو نمبر ۲) سے پیپلز پارٹی کے منتخب ممبر قومی اسمبلی ملک سکندر کے چیف الیکشن ایجنٹ کو تار ارسال کیا کہ ۷ دسمبر کو سندھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور عملہ کے بعض ارکان کے ایما پر یونیورسٹی اسٹاف بس نمبر ایچ ڈی ۱۲۰۰ اور دیگر گاڑیاں ایچ ڈی ۱۲۴۰ ایچ ڈی اے ۷۰۴۲ اور کے اے کے ۸۰۰۷ یونیورسٹی کالونی کے ووٹروں پر اثر انداز ہو کر جی ایم سید کے حق میں انہیں صبح تا دوپہر پولنگ اسٹیشن پہنچاتی رہیں۔ اس واقعہ سے ناظرین اندازہ کر سکتے ہیں کہ پیپلز پارٹی کے چیئرمین بھٹو پر نواب مظفر کی الزام تراشی میں کتنی صداقت ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مخالف محاذ کی صف آرائی کے باوجود نواب مظفر اور جی ایم سید کے مقاصد میں کس قدر یگانگت ہے اور ظاہری اختلاف کے باوجود دونوں بزرگوں کا مقصد لسانی اور علاقائی جذبات بھڑکانا اور عوام میں پھوٹ ڈالنا ہے۔

اشتعال انگیزی بند کرائی جائے

سندھ کے امن پسند عوام اس بات پر متفق ہیں کہ حکومت کو چاہیئے کہ وہ مصلحت کوشی کے بجائے کسی ناخوشگوار واقعہ یا المیہ کے رونما ہونے سے قبل ہی احتیاطی اقدامات کرے اور تنگ نظری اور عصبیت پر مبنی فسطائی محاذوں کی منفی و مجنونانہ ریشہ دوانیوں کا موثر سدباب کرنے ساتھ ہی ترقی پسند اور عوام دوست قوتوں پر بھی لازم ہے کہ وہ رجعت پسند اور فرقہ پرست عناصر کی فتنہ انگیزی کے بے لگام ہونے سے پہلے بھی اس کا تدارک کریں تاکہ انتخابات میں حاصل کی ہوئی کامیابی عوام کے حق میں نتیجہ خیز ثابت ہو۔ سیاست میں ملوث حکام کا فوری طور پر تبادلہ کیا جائے جو انتظامیہ اور تعلیمی اداروں کے کلیدی مناصب پر فائز ہو کر اشتعال انگیز اقدامات کر رہے ہیں بلکہ اپنی اپنی پسند کے فرقہ پرست محاذوں کو پس پردہ شہ دے کر امن عامہ کے لئے سنگین مسئلہ پیدا کر رہے ہیں اور غالباً وہ یہ نہیں چاہتے کہ اقتدار پرامن طور پر جمہور کو منتقل ہو۔

یہاں عوامی حلقے اور سیاسی کارکن اس بات کے بھی خواہاں ہیں کہ پیپلز پارٹی اور نیپ سیاسی مصلحتوں سے بالاتر ہو کر اخلاقی جرأت کے ساتھ متنازعہ مسائل کے بارے میں اپنے موقف کو واضح کریں تاکہ عوام کے ذہنوں میں پیدا کی جانے والی الجھنیں دور ہوں اور وہ رجعت پسند لیڈروں کی نعرے بازی کا شکار نہ ہوں۔

نئی سندھ اسمبلی میں آزاد ارکان کے تعاون سے عوامی لیگ پارلیمانی پارٹی قائم کی جائے گی!

ایک دردمند مسلمان کے قلم سے

کیا ہمارے لئے مل جل کر کام کرنا گناہ ہے؟

عوام کے اعتماد کا دائرہ جتنا ہی وسیع ہو، اتنا ہی اچھا ہے

میں دوبارہ انتہائی دلسوزی کے ساتھ یہ عرض کرنے پر مجبور ہوں کہ انتخابات کی وجہ سے جو خوشگوار امیدیں پیدا ہوئی تھیں وہ آہستہ آہستہ ایسی صورت اختیار کرتی جا رہی ہیں۔ گویا یہ سیمیا کا ایک کرشمہ تھیں اور بس۔ پندرہ بیس پارٹیوں کے ہنگامہ زار کی جگہ ملک میں دو بڑی پارٹیوں کی غیر معمولی کامیابی نے بہت سی مشکلات کا خاتمہ کر دیا تھا، کیونکہ پانچ دس لیڈروں کا باہم گفت و شنید سے ایک رائے پر پہنچ جانا سہل تھا۔ اس کے بعد متفرق چھوٹی چھوٹی پارٹیوں کو ہمنوا بنا لینے میں غالباً کوئی دقت پیش نہ آتی۔

یہ بھی عرض کر دوں کہ ہم جس دور سے گذر رہے ہیں، اس میں ایک یا دو پارٹیوں کی غیر معمولی کامیابی کی بنا پر چھوٹے گروہوں سے بے پروا ہو جانا یا اپنی اکثریت پر غرور و تکبر کا انداز اختیار کر لینا اور بیانات میں دوسروں کے لئے تحقیر و تعریض سے کام لینا بہترین جمہوری مقاصد ہی نہیں، نفس اجزاء جمہوریت کے بھی منافی ہے۔ جمہوریت کو خوش اسلوبی کے ساتھ چلانے اور سب کے دلوں میں روح اعتماد قائم رکھنے کی شکل یہی ہے کہ ایک بھی فرد کو کسی نوع کی تشویش پیدا نہ ہو، اگرچہ وہ انتخابات میں ایک خاص نقطۂ نگاہ اختیار کر کے ناکام ہو چکا ہو۔ جمہوریت کی بنیاد و اساس عوام کا اعتماد ہے اور اعتماد کا دائرہ جتنا زیادہ وسیع ہوگا، اتنا ہی آئندہ کے لئے اچھا ہو۔

حقیقی جمہوریت کا مفہوم

انتخابات میں اختلاف رکھنے والے اصحاب بھی ہماری قوم ہی کے اجزا ہیں۔ اس وجہ سے ہمارے بھائی ہیں۔ ان سے اختلاف صرف پروگرام میں ہو سکتا ہے۔ اگر ایک گروہ کے بجائے قوم دوسرے گروہ کے پروگرام کی توثیق کرے اور اس گروہ کے لئے اکثریت حاصل کرنے کا موقع نکل آئے تو کیا دوسرا گروہ دائرۂ قومیت سے خارج ہو جائے گا؟ ہرگز نہیں۔ جو لوگ ایسا سمجھیں تو خدا شاہد ہے کہ میرے نزدیک وہ سرے سے قومی اعتماد کے لائق و شایاں ہی نہیں۔ میں اور اصحاب کے متعلق کچھ کہہ نہیں سکتا اور نہ کہنا چاہتا ہوں۔ لیکن میرے نزدیک انتخابات کا فیصلہ صادر ہوتے ہی تمام اختلافات ختم ہو جاتے ہیں اور خود اسمبلیوں میں بھی کسی پروگرام کی مختلف شقوں سے اختلاف کرنے والوں کے متعلق محض یہ سمجھا جائے گا کہ انہیں وہ شقیں معرض نظر آئیں۔ جب فیصلہ خلاف صادر ہو گیا تو ان کے ساتھ کاوش کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی۔ جمہوریت کو حقیقی معنوں میں کامیاب بنانے، قوم کے تمام افراد اور تمام گروہوں میں ہم آہنگی، اتحاد اور یکجہتی قائم رکھنے کی صورتیں اور تدبیریں یہی ہیں۔ ان کے سوا جو کچھ کیا جائے گا وہ ہر اعتبار سے غلط ہوگا اور نتائج کے ذمہ دار وہی لوگ گردانے جائیں گے، جنہوں نے جمہوری طریق کار کے جائز حدود سے تجاوز کیا۔ پھر ہم میں اکثریت بفضل اللہ مسلمانوں کو حاصل ہے دوسرں کا طریقہ خواہ کچھ ہو، ہمارا طریقہ غلط نہیں ہونا چاہئے۔

سب کو ساتھ لے کر چلئے

سب سے پہلے اس ذہنیت کا ماتم کرنا چاہئے، جس کا اظہار گذشتہ چند روز میں کئی مرتبہ ہو چکا ہے کہ ملک کی سب سے بڑی کامیاب پارٹی کے بعض افراد نے کہا ہم اکثریت کی بنا پر اپنی مرضی کا دستور بنا سکتے ہیں اور اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے کے حقدار ہیں۔

یقیناً نفس اکثریت کا مطلب یہی ہے اور اس سے اصولاً اختلاف کی کوئی وجہ نہیں۔ تاہم کیا آج عملاً کسی جماعت کے لیے زیبا ہے کہ وہ نفس اکثریت پر انحصار کرے اور اسے پاکستان کے خاص حالات کے پیش نظر مناسب سمجھے، حقیقت یہ ہے کہ یہ تعمیر کا راستہ نہیں فی الجملہ تخریب کا راستہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ تعمیر کی حیثیت ثانوی رہ جائے اور کشمکش، اختلاف اور مزاحمت کو تمام معاملات پر فوقیت حاصل ہو جائے۔ ایسی باتیں کہنے والوں کے متعلق کم سے کم یہی کہا جا سکتا ہے کہ نہ انہیں پاکستان کے موجودہ حالات کا صحیح اندازہ ہے نہ وہ اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ ان کا اختیار کردہ راستہ کل حالات ملک و قوم کو کہاں پہنچا دے گا! یہ بھی ظاہر ہے کہ اب تک فلاح و بہبود کا کوئی کام کر نہ سکنے کے اسباب و عوامل سے بھی وہ لوگ آنکھیں بند کئے بیٹھے ہیں۔

میرے خیال میں جمہوریت کا جو تصور رہے، یہ ہے کہ کسی پروگرام کے متعلق عوام کی منظوری حاصل کر لینے میں اختلاف جائز اور عین مطابق جمہوریت ہے۔ لیکن جب یہ معاملہ طے ہو جائے۔ یعنی عوام منظوری دے دیں تو اختلاف رکھنے والے بھائیوں سے بھی جھگڑا باقی نہ رہنا چاہئے، بلکہ سب کو ساتھ ملا کر تعمیری اقدامات کرنے چاہئیں، کیوں؟ اس لئے کہ اختلاف رکھنے والے بھائی بھی منظور شدہ پروگرام سے فائدہ اٹھانے کے ویسے ہی حقدار ہوں گے، جیسے کہ اتفاق رکھنے والے ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے متواتر عرض کیا ہے جو لوگ اختلاف کر کے ناکام رہے، ان کے خلاف تعریض و تحقیر کا انداز بالکل اختیار نہ کیا جائے بلکہ کہا جائے، بھائیو! عوام نے جس پروگرام کی منظوری دے دی ہے، اسے کامیاب بنانے کے لئے پورا تعاون کرو یا کم از کم مزاحمت ترک کر دو تاکہ ہمارا تعمیری کاروبار اطمینان سے فروغ پائے ہم خوشگواری اور عدم اختلاف کی صورت میں قدم آگے بڑھائیں اور آپس میں لڑ جھگڑ کر آئندہ کے لئے تعاون کی ہر امید کو ختم نہ کر دیں۔

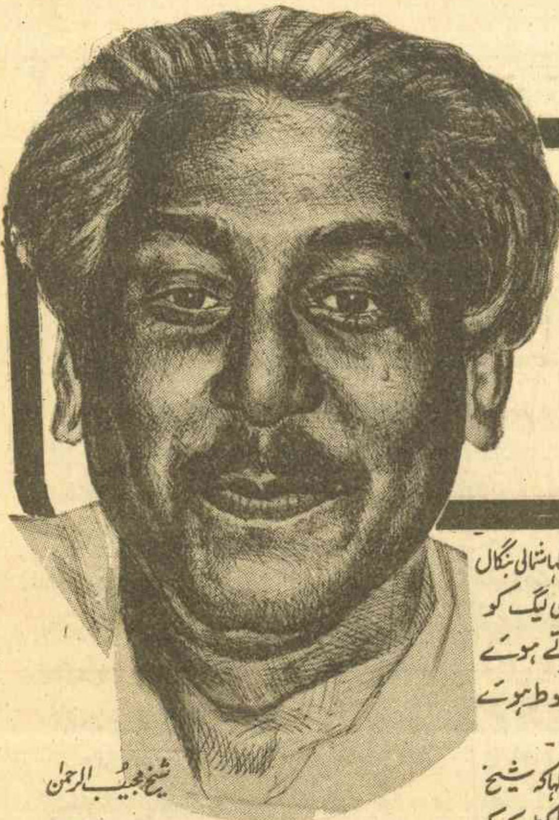
اگر کوئی فریق کہے کہ ہمیں سو میں سے پچپن ووٹ حاصل ہیں۔ لہٰذا ہم جو چاہیں کریں تو میں عرض کروں گا کہ بھائی باقی پینتالیس ووٹ بھی ساتھ لے لینے کی تدبیر کیوں اختیار نہیں کرتے؟ اس طرح کام کا سرانجام بھی بدرجہا بہتر طریق پر ہوگا۔ ملک و قوم کی فضا بھی بے حد خوشگوار رہے گی۔ جماعت بندی گروہ بازی کا جذبہ بھی جوش میں نہ آئے گا۔ جس جماعت کو بلحاظ تعداد اکثریت حاصل ہے۔ اس کے خلاف کسی کشمکش کی نوبت بھی نہ آئے گی۔ ملک کی آبادی میں ہم مسلمانوں کو بفضل اللہ بہت بڑی اکثریت حاصل ہے کیا ہمارا فرض نہیں کہ جمہوری کاروبار میں بھی ہم بہتر روش اور خوشگوارتر اوضاع و اطوار دنیا کے سامنے پیش کریں؟

اب اختلافات ختم ہو گئے

ہم سب ایک ملک کے باشندے اور ایک قوم کے افراد ہیں، کیوں یہ طے نہ کر لیں کہ ہمارے اختلاف کا دائرہ بہت محدود ہے اور اتفاق و اتحاد وبہرحال اصل کار ہے ہم تعمیری پروگراموں کے بارے میں ایک دوسرے سے اختلاف کر سکتے ہیں جب افراد قوم یا نمائندگان قوم کی اکثریت نے کسی ایک پروگرام کی منظوری دے دی تو ساتھ ہی ہمارا اختلاف بھی ختم ہو گیا اب جن جماعتوں کو منظوری ملی ان کے ہاتھ میں معاملات کی باگ ڈور ہو گی۔ باقی جماعتیں اور گروہ خوش دلی کے ساتھ اس پروگرام کو کامیاب بنانے کی مساعی میں شریک ہوں۔ آخر اس سے کسی جماعت کی شان یا ساکھ یا کاروبار پر کیا اثر پڑ سکتا ہے اور کیوں پڑے؟ میرے نزدیک تو اس طرح رفتہ رفتہ اختلافات کا دائرہ بالکل ختم ہو سکتا ہے۔ واضح رہے کہ اس طرح قوم کی تنظیم زیادہ مستحکم ہوتی جائے گی۔ اگر یہ طریقہ ترک کر دیا گیا جب کہ مختلف افراد کے بیانات سے ظاہر ہو رہا ہے تو خدا کے لئے سوچ لیجئے کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟ وہ اتنا بھیانک اور خوفناک ہے کہ اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ قائد اعظم مرحوم نے جس پاکستان کا تصور کیا تھا، اس کے داخلی حالات اور اوضاع و اطوار میرے اندازے کے مطابق ایسے ہی تھے اور انہی پہ ہمارا مدار و انحصار ہونا چاہئے، مجھے امید رکھنی چاہیئے کہ انتشار افزا طریقے چھوڑ کر اتحاد و اتفاق پر خاص توجہ فرمائی جائے گی۔

ظہیر اختر بیدری

کیا فرماتے ہیں اسلام پسند علمائے سیاست بیچ چھ نکات کے؟


شیخ مجیب الرحمن

تھا جو نا خوب بتدریج وہی خوب ہوا

پاکستان کے اسلام پسند سیاست دانوں نے جتنا شور اسلامی سوشلزم کے خلاف مچایا تھا اتنا ہی عوامی لیگ کے چھ نکاتی پروگرام کے خلاف بھی۔ لیکن انتخابات کے نتائج کے بعد اب ان اسلام پسندوں کو چھ نکات میں کوئی برائی نظر نہیں آرہی ہے۔ بلکہ اب تو اسلام پسندوں کی اکثریت بھٹو کے خلاف بغض معاویہ میں شیخ مجیب الرحمن سے محبت کی پینگیں بڑھا رہی ہے! چھ نکات کے خلاف ۱۹۷۰ء میں اسلام پسندوں نے جو بیانات جاری کئے تھے اور انتخابی جلسوں میں جو تقاریر کیں تھیں۔ ذیل میں ہم ان کے اقتباسات روزنامہ جنگ کراچی کے حوالے سے نقل کر رہے ہیں تاکہ قارئین کرام کو اسلام پسندوں کی موقع پرستی کا اندازہ ہو سکے۔!

۲۳ فروری، بہاولپور:۔ جماعت اسلامی کے ایک رہنما اسعد گیلانی نے کہا کہ ویت نام کے خلاف جنگ میں شکست کے بعد امریکہ نے چین کے خلاف گوریلا جنگ کے لئے مشرقی پاکستان کو منتخب کیا ہے۔ انہوں نے کہا شیخ مجیب کے چھ نکات انگریزی زبان میں تیار کئے گئے ہیں جو امریکی مقاصد پورے کرتے ہیں اور اسلام کے منافی ہیں۔

لاہور، یکم مارچ۔ میاں طفیل محمد نے کہا کہ ایک غیر ملکی سفارت خانے کے عملے نے مشرقی پاکستان جاکر عوام کو چھ نکات کی حمایت کا مشورہ دیا۔

کھلنا، ۶ مارچ۔ پروفیسر غلام اعظم نے کہا کہ چھ نکات نہ صرف اسلامی اصولوں کی نفی کرتے ہیں بلکہ فیڈریشن کے اصولوں کے بھی خلاف ہیں۔

راولپنڈی۔ ۸ مارچ۔ جماعت اسلامی نے ایک قرارداد کے ذریعہ امریکی سفیر کی واپسی کا مطالبہ کرتے ہوئے بتایا کہ امریکی سفارت خانہ کے بعض ممبر ایک مقامی پروفیسر کے ہمراہ راولپنڈی کے کئی دیہاتوں میں گئے اور عوام کو بتایا کہ شیخ مجیب الرحمن وزیر اعظم بننے والے ہیں۔

ایشورڈی۔ ۱۱ مارچ۔ پروفیسر اعظم نے کہا شمالی بنگال کا ایک علیحدہ صوبہ قائم کیا جائے انہوں نے عوامی لیگ کو مشرقی پاکستان میں غنڈہ گردی کا ذمہ دار ٹھہراتے ہوئے کہا کہ چھ نکات سے سامراجیوں کے ہاتھ مضبوط ہوئے ہیں اور جمہوریت کی بحالی کو نقصان پہنچا ہے۔

لاہور، ۱۲ مارچ۔ میاں طفیل محمد نے کہا کہ شیخ مجیب الرحمن چھ نکات کے ذریعہ ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے بھارت کے لئے تر نوالہ بنانا چاہتے ہیں۔

راولپنڈی۔ ۱۷ مارچ۔ جماعت اسلامی کے پارلیمانی امور کے ناظم سید صدیق الحسن گیلانی نے کہا مجیب نے ۵۴ء سے ۵۸ء تک اپنے دور اقتدار میں جن لوگوں کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا تھا وہی لوگ چھ نکات کی حمایت کر رہے ہیں۔

سیالکوٹ۔ ۱۱ اپریل۔ میاں طفیل محمد نے کہا کہ سوشلزم اور بنگلہ دیش کے حامی بھارت اور مغربی بنگال چلے جائیں ان کے لئے پاکستان میں کوئی جگہ نہیں۔

چھ نکات ایک غیر ملکی سفارت خانے کی دریافت ہے

— طفیل محمد

نوشہرہ۔ ۳ مئی۔ پروفیسر غلام اعظم نے کہا کہ بھارت کی طرف سے شیخ مجیب الرحمن کی مسلسل حمایت اور ریڈیو سے بنگالی قومیت کا پروپیگنڈہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ بڑی طاقتیں مشرقی پاکستان کو الگ کرانا چاہتی ہیں۔

راولپنڈی۔ ۳ مئی۔ غلام اعظم نے کہا کہ آئندہ انتخابات میں شیخ مجیب الرحمن کی طاقت کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ پشاور میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ شیخ مجیب الرحمن سیکولرزم کی تبلیغ کر رہے ہیں اور ان کے چھ نکات نہ صرف قومی سالمیت بلکہ مشرقی پاکستان کے مفادات کے بھی منافی ہیں۔

لائلپور۔ ۶ مئی۔ پروفیسر غلام اعظم نے کہا کہ مشرقی پاکستان میں جماعت کی مقبولیت سے شیخ مجیب کے چھکے چھوٹ گئے ہیں۔

حیدرآباد۔ ۷ جون۔ پروفیسر غلام اعظم نے کہا کہ شیخ مجیب الرحمن دشمن ملکوں سے پیسے لے کر جلسے کرتے ہیں۔

۵ جنوری۔ چودھری محمد علی نے "قوم سے التماس" کے زیر عنوان اپنے سلسلۂ مضامین کی آخری قسط میں فرمایا ہے۔ عوامی لیگ نے مشرقی پاکستان کے لئے جس نوعیت کی خود مختاری کا مطالبہ کیا ہے اگر اس پر عملدرآمد کیا گیا تو اس کا منطقی نتیجہ ملک کی بربادی کی صورت میں نکلے گا۔

پشاور۔ ۹ جنوری۔ پاکستان مسلم لیگ کے صدر قیوم خان نے کہا کہ پاکستان کے لئے دوسرا بڑا خطرہ شیخ مجیب الرحمن کے چھ نکات ہیں جن میں صوبوں کو آزاد کرنے اور مرکز کو زیادہ سے زیادہ کمزور کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

لاہور۔ ۹ فروری۔ مسٹر فضل القادر چودھری نے ہفت روزہ چٹان کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ شیخ مجیب کے چھ نکات ملک کی تباہی کا سامان ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ مجیب بہک گئے ہیں۔

لاہور۔ ۱۹ فروری۔ میاں ممتاز دولتانہ نے اپنے گھر پر ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے چھ نکات کی ہمیشہ مخالفت کی ہے جب مجیب نے اپنے چھ نکات پیش کئے تھے تو ہماری جماعت نے بارہ صفحات پر مشتمل ایک قرارداد ان کے خلاف منظور کی۔ ہمارا ایمان ہے کہ شیخ مجیب کے چھ نکات پاکستان کی سالمیت کے خلاف ہیں۔

نمائندہ خصوصی

کراچی - ۲۱ فروری - پیر پگاڑو نے کہا کہ انہوں نے عوامی لیگ سے علیحدگی اس لئے اختیار کی ہے کیونکہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ تنگ نظر اور تعصبانہ مسائل پر شیخ مجیب الرحمٰن کے اصرار کی وجہ سے پاکستان کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے -

نواب شاہ - ۷ مارچ میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ نے کہا کہ جی ایم سید نے مجیب کے چھ نکات کی حمایت کر کے انتخابی معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے جس کی وجہ سے مسلم لیگ اس معاہدہ سے الگ ہو گئی ہے کیونکہ مسلم لیگ کسی قیمت پر چھ نکات کی حمایت نہیں کر سکتی -

کوٹری گرام - ۱۰ مارچ - پاکستان مسلم لیگ کے جنرل سکریٹری مسٹر ابوالقاسم نے کہا کہ شیخ مجیب کے چھ نکات کا مطلب ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا ہے - انہوں نے کہا مجیب پاکستان میں لادینی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں -

کوہاٹ ۱۴ مارچ - خان عبدالقیوم خاں نے کہا کہ اگر مجیب کے چھ نکات پر عمل کیا گیا تو مرکز ایک زندہ لاش بن جائے گا -

جلیسور ۱۵ مارچ - پاکستان مسلم لیگ کے جنرل سکریٹری خواجہ خیرالدین نے کہا کہ اگر مجیب الرحمٰن کے چھ نکات پر عمل کیا گیا - تو پاکستان کی جڑیں کٹ جائیں گی -

پشاور ۱۳ مارچ - مغربی پاکستان مسلم لیگ کے صدر مسٹر یسین وٹو نے کہا کہ عوامی لیگ کے چھ نکات مرکز کو کمزور کرنے کی ایک سازش ہے اور ہم اسے کسی قیمت پر پورا نہ ہونے دیں گے -

بہاولپور - ۲۴ اپریل - پاکستان مسلم لیگ کے چیف آرگنائزر مخدوم زادہ حسن محمود نے کہا کہ شیخ مجیب کے چھ نکات کا مطلب پاکستان کو پانچ ریاستوں میں بانٹنا ہے - انہوں نے کہا کہ مجیب اپنے چھ نکات کو منوا کر قوم کی وحدت اور ملک کی سالمیت کو تباہ کرنا چاہتے ہیں -

برہمن باڑیہ - ۵ جنوری - پاکستان جمہوری پارٹی کے نائب صدر مولوی فرید احمد نے کہا اگر مجیب کے چھ نکات پر عمل کیا گیا تو ملک کے اتحاد کو سنگین خطرہ لاحق ہو جائے گا - انہوں نے مجیب سے کہا کہ وہ صاف صاف علیحدگی کا مطالبہ کیوں نہیں کرتے -

گوجرانوالہ ۹ جنوری - نواب زادہ نصراللہ خاں نے کہا چھ نکات کا نعرہ لگا کر مجیب ملک میں دوبارہ مارشل لا لگانا چاہتے ہیں -

لاہور - ۱۸ جنوری - نواب زادہ نصراللہ خاں نے کہا، مشرقی پاکستان میں ایک کروڑ مضبوط ہندو پاکستان کی موجودہ صورت حال سے بہت خوش ہیں - ہندو مجیب کی اس لئے حمایت کر رہے ہیں کہ ان کے چھ نکات کے ذریعہ ہندوؤں کے منصوبوں کی تکمیل ہو جائے گی -

سرگودھا ۳۰ جنوری - نواب زادہ نصراللہ خاں نے کہا شیخ مجیب الرحمٰن کے چھ نکات ملک کو کمزور کرنے کی چال کے علاوہ کچھ نہیں -

حافظ آباد - ۱۸ فروری - پی ڈی پی پنجاب زون کے صدر مسٹر ایم اے حمزہ نے کہا شیخ مجیب الرحمٰن کے چھ نکات پر عملدرآمد سے ملک کا شیرازہ بکھر جائے گا -

لاہور ۲۳ فروری - جسٹس پارٹی نے اپنے سابق سربراہ ایئر مارشل اصغر خاں پر الزام لگایا کہ انہوں نے چھ نکات پر شیخ مجیب الرحمٰن سے سمجھوتہ کر لیا ہے -

کراچی ، ۲ فروری - چودھری خلیق الزمان نے کہا کہ مشرقی پاکستان کے کسی رہنما نے شیخ مجیب کے شرانگیز مطالبوں کی حمایت نہیں کی انہوں نے کہا کہ مجیب کے مطالبے کا مقصد دونوں بازوؤں کو الگ کرنا ہے -

لاڑکانہ ، ۲ فروری - مسٹر ایوب کھوڑو نے کہا کہ وہ سندھ متحدہ محاذ میں رہ کر مجیب الرحمٰن کے چھ نکات کی حمایت نہیں کر سکتے اگر جی ایم سید مجیب کے چھ نکات کی حمایت ترک نہیں کریں گے، تو میں متحدہ محاذ سے الگ ہو جاؤں گا -

لاڑکانہ ، ۲۰ مارچ - مسٹر ایوب کھوڑو نے کہا اگر مجیب کے چھ نکات کو مان لیا جائے تو پاکستان چھ مہینے بھی قائم نہیں رہ سکتا -

کراچی ۵ مئی - پی ڈی پی کے صدر مسٹر نورالامین نے کہا کہ مشرقی پاکستان کی سیاست پر ہندوؤں کا گہرا اثر ہے بہت سے ہندو عوامی لیگ میں شامل ہو گئے ہیں -

کراچی ۹ مئی ایئر مارشل اصغر خاں نے کہا مجھے شیخ مجیب کے کئی نکات سے اختلاف ہے -

یہ لوگ جہادِ جمہوریت کی صفِ اوّل میں تھے — اب جیل میں ہیں

۵ جنوری کو معلوم ہوا کہ داؤد ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ یونین کے دو مزدور رہنما ریاض حسن خاں اور عزیز الحسن کو خصوصی فوجی عدالت میں ان کے مقدمات کا فیصلہ سنانے کے لئے خیرپور جیل سے کراچی لایا جا رہا ہے - ۶ جنوری کو جب میں سندھ اسمبلی بلڈنگ میں پہنچا تو بیڑیوں اور ہتھکڑیوں میں بندھے ہوئے دونوں "قیدی" بے اختیار مجھ سے لپٹ گئے "زنجیریں اگرچہ ہمارے سینوں میں چبھ رہی تھیں، لیکن مجھے یوں لگ رہا تھا کہ مزدوروں کے سینوں میں برسوں سے دھکنے والے الاؤ کی تپش سے جلد ہی تمام زنجیریں پگھلنے والی ہیں" -

ریاض حسن نے مسکراتے ہوئے بتایا مجھے صرف چار سال قید بامشقت کی سزا دی گئی ہے" ریاض حسن کے چہرے پر تردد یا فکر کا کوئی نشان نہ تھا، اس کی آنکھوں کی چمک اس کے آہنی عزائم کی ترجمان تھی -

دوسرے مزدور کارکن گل محمد کو دو سال قید بامشقت کی سزا ملی تھی - لیکن "مجرم" وہاں موجود نہ تھا معلوم ہوا پولیس اسے کراچی سنٹرل جیل لے گئی - ریاض حسن اور عزیز الحسن خیرپور جیل جانے کی تیاری کر رہے تھے - پچھلے سال ملک بھر میں مزدوروں کی ہڑتالوں کا جو سلسلہ چلا تھا - داؤد کاٹن ملز کے مزدور بھی اس میں شامل تھے - اس ملز کے مالکان کا شمار ان چند اجارہ دار سرمایہ داروں میں ہوتا ہے جن کے قبضے میں اسی فی صد ملکی دولت ہے - سائٹ کے انڈسٹریل ایریا میں ولیکا سیٹھ اور لانڈھی کے انڈسٹریل ایریا میں داؤد سیٹھ مزدوروں کے حق میں چنگیز خان بنے ہوئے ہیں، ان ملوں کے سلسلے میں یہ بات بڑی عام ہے کہ یہاں مزدوروں کے لئے باضابطہ جیلیں بنائی گئی تھیں - جہاں مالکان کے مفادات کے خلاف کام کرنے والے کو اذیتیں دی جاتی تھیں ظلم اور ناانصافیوں کے خلاف مزدوروں کے ذہن میں ۲۲ سال سے پکنے والا لاوا فروری ۱۹۶۹ء میں پھٹ پڑا اکتوبر ۶۹ء میں جب سارا ملک ہڑتالوں کی لپیٹ میں آ گیا تو داؤد ملز کے مزدور بھی اس سے نہ بچ سکے - اس سے پہلے مزدوروں نے قانونی حدود میں رہتے ہوئے اپنے مطالبات منوانے کی کوششیں شروع کیں لیکن مالکان کے غیر منافع خور روپے کی وجہ سے ان کی کوششوں کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہو سکا - اس کے برعکس مالکان نے ٹریڈ یونین کے سرگرم کارکنوں کے خلاف انتقامی کارروائیوں کا سلسلہ شروع کر دیا - مالکان کے اس مزدور دشمن اقدام نے جلتی پر تیل کا کام کیا - اور آخرکار ۲۰ مارچ ۱۹۷۰ء کو داؤد ملز میں ہڑتال ہو گئی داؤد ملز کے مزدوروں نے یہ ہڑتال قانون کے تقاضے پورے کرنے کے بعد کی تھی اس ہڑتال کو محکمہ لیبر کی جانب سے بھی غیر قانونی قرار نہیں دیا گیا تھا - لیکن مقامی انتظامیہ نے ہڑتال کو ناکام بنانے کے لئے مالکان سے

زیادہ سرگرمی دکھائی شروع کر دی۔ مار پیٹ، پکڑ دھکڑ اور باہر کے مزدوروں سے کام شروع کرانے کی کوششیں یہ سارے ہتھکنڈے جب ناکام ہو گئے تو ۱۳۔ اپریل ۱۹۷۰ء کو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہنگامہ کروا یا پتھر بازی، لاٹھی سے گولی تک چلی گئی۔ سرکاری اطلاعات کے مطابق ایک مزدور ہلاک اور بے شمار زخمی ہوئے لیکن غیر سرکاری اطلاعات کے مطابق نقصان کا اندازہ اس سے زیادہ تھا۔

سیٹھ کے سامنے مزدوروں پر تشدد

داؤد کی انتظامیہ نے پہلے ہی سے سرگرم کارکنوں کی فہرستیں تیار کر رکھی تھیں جن کے مطابق ریاض حسن خان عزیز الحسن محمد اقبال نجیب اللہ انتہائی خطرناک مزدور تھے۔ ریاض حسین خان کو مختلف ذرائع سے ہموار کرنے کی کوشش کی گئی اور اسی قسم کے ہتھکنڈے عزیز الحسن کے خلاف استعمال کئے گئے ۱۷۵ مزدوروں اور مزدور رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا۔ جب داؤد ملز کے تمام سرگرم کارکن گرفتار کر لئے گئے تو ہڑتال کا ختم ہو جانا ایک لازمی بات تھی!

۱۷۵ مزدوروں کو دو سے تین ماہ تک بغیر مقدمہ چلائے جیل میں بند رکھا گیا اس کے بعد نسبتاً زیادہ سرگرم کارکنوں کے خلاف مارشل لاء اور عام قوانین کے تحت مقدمات کا آغاز ہوا۔ مزدور رہنماؤں کو گرفتاری کے بعد جیل بھجوانے کے بجائے انہیں مختلف پولیس تھانوں میں رکھا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ انہیں تھانوں سے رات کو داؤد ملز لے جا کر سیٹھ کے سامنے ننگا کر کے بری طرح پیٹا گیا۔ یونین کے صدر خواجہ نجیب اللہ کے سر کے بال اکھیڑ دیئے گئے۔ ریاض حسن عزیز الحسن اور قادر وغیرہ کو بھی بے تحاشا پیٹا گیا اس مار پیٹ میں ایک مزدور محمد حسین کے ہاتھ پاؤں ٹوٹ گئے۔ مالکان کی موجودگی میں پولیس کے اس رویے سے مشہور سیاسی و انقلابی مفکرین کے اس قول کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ سرمایہ دارانہ سماج میں حکومت کی مشینری سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ایک ایسے شکنجے کی طرح ہوتی ہے جس میں محنت کشوں کو جکڑ کر رکھا جاتا ہے۔

مارشل لاء کورٹ نے مختلف الزامات کے تحت ریاض حسن خاں کو مجموعی طور پر ایک سال، عزیز الحسن کو ایک سال تین ماہ، نجیب اللہ کو ۹ ماہ، اقبال خاں کو ۶ ماہ اور شاہ جہاں کو ۶ ماہ قید بامشقت کی سزا سنائی گئی تھی۔ لیکن ریاض الحسن، عزیز الحسن اور گل محمد پر مارشل لاء ریگولیشن کے تحت اسپیشل ملٹری کورٹ میں مقدمات ابھی زیر سماعت تھے۔ ۶ جنوری کو خصوصی فوجی عدالت نے ریاض حسن خاں کو مزید چار سال قید بامشقت کی سزا سنائی۔ مغربی پاکستان میں غالباً کسی مزدور رہنما کو مارشل لاء کے تحت اتنی طویل مدت کی سزا نہیں دی گئی ہے۔

۱۸ دسمبر کو صدر یحییٰ خاں نے مارشل لاء کے تحت سیاسی سرگرمیوں میں گرفتار ہونے والے تمام افراد کی رہائی کا حکم دیا تھا۔ اس کے باوجود اب تک کسی مزدور کارکن کو رہا نہیں کیا گیا۔ بعض طالب علم رہنما بھی ابھی جیلوں میں بند ہیں۔ انتظامیہ کا یہ موقف کہ طلبا اور مزدور سیاسی حیثیت کے مالک نہیں ایک بے دلیل بات ہے۔ مزدور اور طالب علم موجودہ دور میں کل سیاست کے محور ہیں۔ ان کو الگ کر کے سیاست یا سیاسی کارکنوں کا تعین کیا ہی نہیں جا سکتا۔ ملک کے گوشے گوشے میں مزدوروں اور طلبا کی رہائی کے مطالبے ہو رہے ہیں۔ حتیٰ کہ انتخابات میں بھاری اکثریت سے جیتنے والی عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی کے سربراہوں نے ان مظلوموں کی رہائی کو وقت کا اولین تقاضہ کہا ہے۔

یہاں اس بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ مزدور رہنماؤں کے ساتھ جیلوں میں اذیت ناک سلوک کیا جا رہا ہے۔ گذشتہ نومبر میں داؤد ملز کے رہنماؤں اور ڈاکٹر رشید حسن کو کراچی جیل سے حیدر آباد اور خیر پور جیل منتقل کر دیا گیا۔ خیر پور جیل میں تمام مزدور رہنماؤں کو ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کے ساتھ پنشمنٹ وارڈ میں بند کر دیا گیا جہاں انہیں طرح طرح سے اذیتیں دی گئیں۔ کھانے اور پینے کا پانی تک سیل سے باہر رکھا گیا اور سلاخوں سے باہر ہاتھ نکال کر مزدور رہنماؤں کو کھانے پینے پر مجبور کیا گیا۔ پندرہ دن تک نہ انہیں سردی سے بچنے کے لئے معقول کپڑے دیئے گئے اور نہ شیو کا انتظام کیا گیا۔ حتیٰ کہ عیدالفطر کے دن بھی نماز سے صرف دس منٹ پہلے انہیں ان کی کوٹھڑیوں سے باہر نکالا گیا اور نماز کے بعد پھر بند کر دیا گیا۔

سرمایہ دار نوشتۂ دیوار پڑھ لیں

حکومت کا فرض ہے کہ مذکورہ بالا معاملات کے بارے میں تحقیقات کرائے تشدد سے ہمیشہ نفرت بڑھتی ہے اور بڑھتی ہوئی نفرت نظم و نسق اور امن عامہ کے لئے ایک مستقل خطرہ بنی رہتی ہے۔ سرمایہ دار اگر یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ایک عبوری حکومت کی آڑ لیکر ہمیشہ کے لئے مزدوروں کو دبانے اور دہشت زدہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے تو یہ ان کی بہت بڑی بھول ہے انہیں بہرحال اپنے اعمال کی جلد جوابدہی کرنی پڑے گی۔

لانڈھی انڈسٹریل ایریا میں مزدوروں نے بعض دیواروں پر لکھا ہے "سرمایہ داروں کو حکومت کب تک بچائے گی؟ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔

سرمایہ دار یہ نوشتۂ دیوار پڑھ لیں اور اپنے رویے میں تبدیلی لائیں تو یہ انہیں کے حق میں مفید ہوگا۔

آخر میں ہم ایک بار پھر صدر مملکت کی توجہ اس جانب مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ تمام گرفتار مزدوروں اور طالب علموں کو رہا کر کے حالات کو اقتدار کی پُر امن منتقلی کے لئے سازگار بنائیں اور سینکڑوں فاقہ کش مزدور خاندانوں کے ساتھ انصاف کریں!

زیب ٹیکسٹائل ملز کی انتظامیہ

مزدوروں کو ہراساں کر رہی ہے

زیب تن ٹیکسٹائل ملز کی انتظامیہ معاہدے کے تحت مزدور رہنماؤں سے ملاقات میں بونس کا تصفیہ کرنے کی بجائے یک طرفہ طور پر ۱۳-۴ دن کی اجرت بطور بونس ادا کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ مالکان نے اتفاقی چھٹی، بیماری کی چھٹی اور خاص چھٹیوں کو حاضری شمار کرنے سے انکار کر دیا ہے اور ان ایام کا بونس کم کر دیا گیا ہے۔

عثمان بلوچ صدر متحدہ مزدور فیڈریشن نے کہا ہے کہ جب سے زیب تن ملز کی یونین نے ان کی فیڈریشن سے الحاق کیا ہے مالکان کا رویہ سخت ہو گیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ انتخابات کے موقعوں پر ۷ اور ۱۷ دسمبر کی چھٹیاں جو حکومت کی طرف سے دی گئی تھیں، انہیں بھی چھٹیوں کی تعداد میں سے وضع کیا جا رہا ہے جو مزدور یونین کے کاموں میں حصہ لیتے ہیں انہیں مختلف بہانوں سے نکالا جا رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اب تک ۲۵ کے قریب مزدور نکالے جا چکے ہیں۔ ان میں بابر خان، محمد خان، اکبر جان، وحید زماں، بسمین خان اور خورشید وغیرہ شامل ہیں۔ [illegible] مزدوروں کو نئے کارڈ دیکر انہیں مستقل طور [illegible] مزدور بنائے رکھنے کی کوشش سارے [illegible] مالکوں کا اصول بن گئی ہے۔ اس کھلی بدعنوانی کے خلاف نہ قانون حرکت میں آتا ہے نہ حکومت کے کان پر جوں رینگتی ہے۔ انہوں نے ولیکا ٹیکسٹائل ملز کے بارے میں بتایا کہ اس کی انتظامیہ نے مزدوروں میں انتشار پھیلانے کے لئے ایک نیا طریقہ اپنایا ہے۔ ملز کے قیام سے اب تک کاٹن اور وولن کے مزدوروں کے لئے ملز میں داخلے کا ایک ہی گیٹ تھا لیکن اب سیٹھ نے دونوں شعبوں کے الگ الگ دروازے بنا دیتے ہیں۔ اس حرکت کا مقصد مزدوروں کو آپس میں ملنے سے روکنا ہے۔ انہوں نے کہا پچھلے سال ہونے والے معاہدے کے تحت جیل سے رہا ہو کر آنے والے مزدور کو ڈیوٹی پر لینا تھا لیکن مزدوروں کو جیل سے رہا ہوئے ۹، ۱۰ ماہ ہو رہے ہیں ابھی تک انتظامیہ ان مزدوروں کو کام پر واپس لینے کے لئے تیار نہیں۔ اس رویئے سے مزدوروں میں سخت بے چینی پھیل رہی ہے اگر مالکان کے ان مظالم کا سدّباب نہ کیا گیا تو حالات پھر خراب ہو سکتے ہیں۔ واضح رہے کہ مارشل لاء کے بعد سب سے پہلے ولیکا ٹیکسٹائل ملز ہی سے ہڑتالوں کی ابتدا ہوئی تھی جس کے سلسلے میں کئی مزدوروں کے علاوہ متحدہ مزدور فیڈریشن کے عثمان بلوچ شاہ رضا خاں اور ظہیر اختر بیدری کو مارشل لاء عدالت سے مختلف میعاد کی سزائیں دی گئی تھیں۔

کفر کے بعد اب جہل کا فتویٰ

جن خود پسند اسلام پسندوں نے الیکشن کو کفر و اسلام کا معیار قرار دے کر مسلمانانِ پاکستان کو دو پارٹیوں میں بانٹ دیا تھا کہ ان میں سے جوان خود پسندوں کا ساتھ دے گا۔ وہ تو مسلمان ہے اور جو ان کا ساتھ نہ دے گا وہ کافر اور بے دین ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی خود پسند پاکستان میں اسلام کے نام پر انتشار پھیلانے کے سب سے بڑے ذمہ دار ہیں اب اپنی رسوائے زمانہ اور عبرت ناک شکست کے بعد یہ فتوے نما بیان دیتے ہیں اور ایک دوسرے سے گفتگو کرتے پھر رہے ہیں کہ جو پڑھا لکھا طبقہ تھا اس نے تو ہم کو ووٹ دیا۔ اور جو جاہل لوگ تھے۔ انہوں نے دوسروں کو ووٹ دیئے۔ گویا کفر و اسلام کے بعد مسلمانانِ پاکستان کی یہ دوسری تقسیم ہے کہ جن لوگوں نے اسلام پسندوں کو ووٹ دیئے وہ مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ پڑھے لکھے اور سمجھدار بھی ہیں اور جنہوں نے ان کو ووٹ نہیں دیئے وہ کافر و بے دین ہونے کے ساتھ ساتھ جاہل، بے وقوف اور ناسمجھ بھی ہیں۔

کس قدر شرم اور افسوس کی بات ہے کہ پاکستان کے جمہور مسلمان کو اور یہاں کے ووٹروں کی اتنی عظیم اکثریت کو جاہل قرار دیا جائے یہ مسلمانانِ پاکستان کی بہت بڑی توہین و تذلیل ہے خود دار اور غیور مسلمانوں کو اس کا نوٹس لینا چاہیئے اور یہ یقین کر لینا چاہیئے کہ ایسے خود پسندوں سے کسی بھی بھلائی اور خیر خواہی کی توقع کیونکر کی جا سکتی ہے؟ اللہ پاکستان اور اہلِ پاکستان کو ایسے خود پسندوں کے شر سے بچائے آمین۔

محمد داؤد قاسمی جونپوری

یونیورسٹی آرڈیننس منسوخ کیا جائے

یونیورسٹی آرڈیننس اب تک موجود ہے۔ اس کی سخت جانی کا اندازہ اس بات سے ہوگا کہ خود صدر یحییٰ نے مارشل لاء کے نفاذ کے بعد یونیورسٹی آرڈیننس کی تنسیخ کا قوم سے وعدہ کیا تھا، لیکن یہ رسوائے زمانہ آرڈیننس مارشل لاء کے دار و گیر سے محفوظ رہا اور صدر کا حتمی وعدہ بھی جھیل گیا۔

حکومت نے اس دوران میں نئی تعلیمی پالیسی وضع کی، جس کے نفاذ کی نوبت نہیں آئی، تاہم یونیورسٹی آرڈیننس کی تنسیخ اس پالیسی کی تدوین کے بعد یقینی نظر آنے لگی تھی۔ وقت خاموشی سے گذرتا رہا۔ نئی تعلیمی پالیسی بھی رفت و گذشت ہوئی، البتہ آرڈیننس جامعات کے سینے پر دھرنا مارے اینٹھ بیٹھا ہے۔

طلباء اور اساتذہ کے صبر و استقامت کی داد دینی چاہیئے کہ اس تمام عرصے میں یونیورسٹی آرڈیننس کی تنسیخ کا پرجوش مطالبہ کرتے آئے ہیں۔ اسکے لئے اخباروں میں بیانات آئے، مضامین لکھے گئے، تقریریں ہوئیں، مظاہرے بھی ہوئے، معمر اور معزز اساتذہ نے ثقاہت بالائے طاق رکھی اور کثرتِ مطالعہ کے علاوہ ڈگریوں سے گرانبار ہونے کے باوجود، ان مظاہروں کی رہنمائی کی، لیکن جہاں دوسرے مطالبات صدا بصحرا ثابت ہوئے وہیں یونیورسٹی آرڈیننس بھی مظاہروں اور نعروں کی یورش سے محفوظ رہا۔

لیکن یقین ہے کہ یونیورسٹی آرڈیننس اب نہ بچ سکے گا۔ عوامی پارٹیاں جو ہمہ گیر اصلاحات کے منصوبے لے کر برسر حکومت آیا چاہتی ہیں۔ یونیورسٹی آرڈیننس کو یک قلم مسترد کر دیں گے، البتہ مناسب بات یہ ہوگی کہ صدر مملکت، اس سے پہلے ہی اس آرڈیننس کو منسوخ کر دیں۔ انہوں نے بہت سے وعدے ایفا کئے ہیں، پھر یہ ایک وعدہ محروم التفات کیوں رہے، اور لوگوں کو یہ کہنے کا موقع کیوں ملے کہ صدر کا ایک وعدہ شرمندۂ ایفا رہ گیا تھا۔

ایک معلم۔ کراچی

احوالِ وطن
صفحہ ۶ سے آگے

سامراجیوں نے ایک ایسی کتاب مہیا کر دی جو پاکستان میں نہ تو کبھی عام فروخت کے لئے درآمد ہوتی ہے، نہ بالعموم دستیاب ہوتی ہے بلکہ یہ بھی طے نہیں ہو سکا کہ برطانیہ میں چھپی یا امریکہ میں!

ہم ان اشتعال انگیز تحریروں کی پوری شدت سے مذمت کرتے ہیں۔ جن سے حضور رسولِ مقبولؐ اور اکابرین کی شان میں گستاخی اور عامۃ المسلمین کی دل آزاری کا پہلو نکلتا ہے، اور ہمیں یقین ہے کہ پاکستانی عوام کے جذبات کی تسکین محض چند دکانوں اور شراب خانوں میں توڑ پھوڑ کے واقعات سے نہیں ہو سکتی۔ ہم نہیں چاہتے کہ سامراجی ممالک ہماری مسلسل دلآزاری کرتے رہیں اور پھر بھی سستے چھوٹ جائیں۔ لہٰذا حکومت سے ہمارا مطالبہ ہے کہ ان ممالک سے لین دین اور کاروبار کا سلسلہ بتدریج کم کرے اور پھر یکسر منقطع کر دے، اس کے ساتھ ہی جو شاہانہ مراعات، سامراجی ملکوں کے کاروباری اداروں کو ہمارے ملک میں حاصل ہیں، وہ فی الفور واپس لی جائیں۔ حکومتِ پاکستان سے ہمارا یہ بھی مطالبہ ہے کہ برطانوی دولتِ مشترکہ سے اور سامراجی ملکوں کے دفاعی معاہدوں سے قطعِ تعلق کر لے۔

گلگت بلتستان میں انتخابات

دیر۔ چترال اور سوات کی ریاستیں حال ہی میں پاکستان میں مدغم کی گئی ہیں۔ یہاں کے شہریوں کو بالغ رائے دہی اور چارہ جوئی کے لئے ہائی کورٹ سے مراجعت کا حق دیا گیا ہے۔ انہیں پاکستان کے دوسرے شہریوں کے مساوی حقوق حاصل ہو گئے ہیں۔ لیکن گلگت اور بلتستان کے سات لاکھ باشندوں کو صرف مشاورتی کونسل کے انتخابات میں شرکت کی رعایت ملی ہے۔ ان انتخابات کی حقیق[ت] کیا ہے؟

مشاورتی کونسل کے تحت، گلگت بلتستان کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ چلاس، داریل اور تانگیر۔ ہنزہ اور نگر گلگت ک[ے] علاقے ہیں۔ لیکن انہیں اتنی معمولی نمائندگی کا بھی اہل نہیں سمجھا گی[ا] باقی علاقوں میں نامزدگی کی گئی ہے۔ واضح ہو کہ ان علاقوں میں فرنٹیئر کرائمز ریگولیشن نافذ ہے۔ ووٹ، گھر گھر جا کر درج نہیں کئے گئے ہیں۔ نہ ووٹروں کی فہرستیں شائع ہوئی ہیں اور نہ ہی اعتراضات کا موقع دیا گیا ہے۔ دفعہ ۱۴۴ نافذ ہے۔ سوال یہ ہے کہ فرنٹیئر کرائمز ریگولیشن جیسے غیر انسانی قانون کی موجودگی میں اور دفعہ ۱۴۴ کی پابندی کے بعد، جب جلسے اور جلوس کی اجازت حتیٰ کہ پانچ افراد کا اجتماع بھی ممکن نہیں، کیا آزادانہ انتخابات ہو سکتے ہیں۔

اس سے قطع نظر کہ اس مشاورتی کونسل کے ارکان کے اختی[ارات] کی ابھی تک صراحت نہیں کی گئی، دلچسپ بات یہ ہے کہ یہاں کی عورتوں کو حق رائے دہی سے بالکل محروم رکھا گیا اور اس علاقے کے کم و بیش بیس لاکھ شہری، جو شخصی حکمرانوں کی سختی اور روزگار کی تنگی کی وجہ سے یا حصول تعلیم کے لئے پاکستان کے دوسرے علاقوں میں جا چکے ہیں نہیں بھی رائے دہی کا حق نہیں دیا گیا ہے۔

پاکستان کے عوام جنہیں مشاورتی کونسل کے انتخابات کی حقیقت معلوم نہیں اور جو حالیہ جمہوری انتخابات کا تجربہ رکھتے [ہیں] اس غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتے ہیں کہ شمال کے ان علاقوں کو بھی مساوی حقوق مل گئے ہیں۔ لیکن حقائق کی روشنی میں یہ غلط فہمیاں بہت جلد رفع ہو جائیں گی۔

رضوان احمد۔ کراچی

طلباء یونین کے عہدیدار

سندھ نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن جیکب آباد نے سالِ رواں کے لئے درج ذیل عہدیدار منتخب کئے ہیں۔

اشفاق حسین جمالی ۔۔۔ صدر
فیض محمد بروہی ۔۔۔ نائب صدر
حق نواز بروہی ۔۔۔ جنرل سیکریٹری
رحیم بخش سومرو ۔۔۔ جوائنٹ سیکریٹری
غلام مصطفیٰ جھکرانی ۔۔۔ پریس سیکریٹری
اقبال احمد۔ سوشل سیکریٹری

کلیم الحسن نقوی پرنٹر انیس ہاشمی پبلشر انجمن پریس میں چھپا۔ دفتر لیل و نہار عظمت منزل، ۱۷/۶ سنٹرل کمرشل

THE LAILO-NAHAAR WEEKLY, KARACHI. R. L. No. S. 2744

24-1-1971



Lailo Nahaar Newsweekly Registered as a Newspaper with the Post Off

in United Kingdom.